پانچویں تحریر:

مسئلۂ تملیک اور زکوٰۃ سے متعلق بعض دوسرے مسائل

(اہلِ علم کے غور و فکر کے لیے)

از: مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

(ترجمان القرآن' ذوالحجہ ۱۳۷۴ھ / اگست ۱۹۵۵ء و محرم ۱۳۷۵ھ / ستمبر ۱۹۵۵ء)

ترجمان القرآن' بابت محرم ۱۳۷۴ھ میں خان محمد صاحب ربانی کا ایک مضمون بعنوان ''حضرات علمائے کرام کی خدمت میں چند سوالات'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں چند ایسے سوال اٹھائے گئے تھے جو ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے تملیک کو رکن یا شرط قرار دینے کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالوں کے جواب میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے دو مکتوب ترجمان القرآن بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۷۴ھ میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مکاتیب میں ان اشکالات کا فقہ حنفی کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کی ہے جو ربانی صاحب نے پیش کیے تھے۔ مجھے مولانا کے بعض پیش کردہ نتائج سے اختلاف ہے' اس وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اپنا نقطۂ نظر بھی ان صفحات میں پیش کر دوں' تاکہ مولانا اور دوسرے اہل علم ان پر غور کر سکیں۔ بحث کی سہولت کے لیے میں پہلے مولانا ظفر احمد صاحب کے خیالات حتی الامکان خود اُن کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بعد اپنی ناچیز معروضات پیش کروں گا۔

تملیک کے متعلق مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے:

> ''تملیکِ فقیر'' زکوٰۃ کے لیے شرط ہی نہیں بلکہ رکن ہے' بلکہ زکوٰۃ کی حقیقت ہی ''تملیکِ فقیر'' ہے۔ زکوٰۃ میں تملیک کا ضروری ہونا متفق علیہ ہے' کسی امام کا اس میں اختلاف بیان نہیں کیا گیا۔ بلکہ امام شافعی کی طرف تو یہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ میں ''لام'' ملک کے لیے ہے۔''

تملیک کو ادائیگیٔ زکوٰۃ کی ایک بنیادی شرط مان لینے کے بعد جہاں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں وہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر اموالِ زکوٰۃ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس منتقل کرنے کے مصارف بھی زکوٰۃ کی مد سے

نہیں ادا کیے جا سکتے' کیونکہ اس میں تملیکِ فقیر نہیں پائی جاتی۔ جس کے معنی دوسرے الفاظ میں یہ ہوئے کہ زکوٰۃ کی چیزوں کو مدِ زکوٰۃ کے مصارف سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے دو جواب مولانا نے دیے ہیں' ایک یہ کہ:

''جس زمانہ میں زکوٰۃ اسلامی حکومت کے ذریعہ سے وصول کی جاتی تھی اس کی یہ صورت نہ تھی کہ عامل تنہا ہر شخص کے مکان یا چراگاہ پر جاتا اور زکوٰۃ وصول کرتا ہو' بلکہ اس کے ساتھ سپاہیوں کا ایک دستہ ہوتا تھا' وہی اس مقام کے تھانہ یا تحصیل میں زکوٰۃ کے مویشی اور اموال جمع کرتے تھے اور اس بستی کے غرباء اسی جگہ جمع ہو جاتے اور ان پر زکوٰۃ تقسیم کر دی جاتی تھی۔ جب تک اس مقام پر فقراء موجود ہوتے دوسرے مقام پر زکوٰۃ منتقل نہ ہوتی تھی۔''

مولانا کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی کہ منتقل کرنے کے مصارف کا سوال پیدا ہو۔ جس کھیت یا کھلیان یا چراگاہ سے زکوٰۃ وصول ہوئی وہیں غرباء و فقراء جمع ہو گئے اور تحصیل داروں نے ان کے اندر زکوٰۃ کے مال کو تقسیم کیا اور دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرا جواب مولانا نے یہ دیا ہے کہ:

''چونکہ ولایتِ عامہ کی وجہ سے امام فقراء کا وکیل ہوتا ہے اور عمال امام کے نائب ہوتے تھے' اگر فقراء کی مصلحت سے زکوٰۃ کو منتقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو امام اور اس کے عمال کو مصارفِ نقل بھی مالِ زکوٰۃ سے وصول کرنے کا حق تھا۔ جیسا خود فقیر مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کر کے اپنے گھر لے جاتا تو مصارفِ نقل اسی مال سے نکال سکتا تھا..... امام یا مصدِق کا مالِ زکوٰۃ پر قبضہ کرنا فقراء ہی کا قبضہ کرنا ہے' کیونکہ وہ بوجہ ولایتِ عامہ کے فقراء کا وکیل ہے۔''

مولانا نے ولایتِ عامہ کا یہ حق صرف ایک ایسی اسلامی حکومت کے لیے تسلیم کیا ہے جو آئینِ اسلام کے مطابق اسلامی حکومت ہو' محض رسمی اور اسمی قسم کی مسلمان حکومتوں کے لیے مولانا یہ حق تسلیم نہیں کرتے کہ وہ ولایتِ عامہ کی مدعی بن کر مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کا مطالبہ کر سکیں۔ مولانا کے اپنے الفاظ یہی ہیں:

''مطالبۂ عشر و زکوٰۃ کا یہ حق اسی حکومتِ مسلمہ کو حاصل ہے جو آئینِ اسلام کے مطابق اسلامی حکومت ہو۔ ہر حکومت کو یہ حق حاصل نہیں جو کہ برائے نام ہی اسلامی حکومت ہو اور واقع میں اسلامی حکومت نہ ہو۔''

اس اصولی جواب کے بعد مولانا نے خود ہی خاص پاکستان کی حکومت سے متعلق بھی یہ

بات صاف کر دی ہے کہ یہ وہ اسلامی حکومت نہیں ہے جو مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کے مطالبہ کی حق دار ہو۔ خود اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

''یہاں سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ بڑا مقصد اسلامی سلطنت قائم کرنے سے امورِ دین کا انتظام' احکامِ شرعیہ کا نفاذ' نماز اور صدقات و زکوٰۃ کا نظم اور شریعت کے موافق مسلمانوں کے معاملات کا فیصلہ کرنا' جہاد اور سامانِ جہاد کا بندوبست کرنا ہے۔ اگر کسی سلطنت سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا تو وہ اسلامی سلطنت نہ ہوگی اگرچہ مسلمانوں کی سلطنت ہو۔ اور صدقات و زکوٰۃ وصول کرنے کا حق اسی سلطنت کو حاصل ہے جو اِس مقصد کو پورا کرے جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے' ورنہ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا۔ پس جو لوگ اسلامی سلطنت میں سیاست اور مذہب کو الگ کرنا چاہتے ہیں وہ اسلامی سلطنت قائم نہیں کرنا چاہتے' بلکہ یورپین طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے پاکستان.....''

اچھا' اگر پاکستان کی حکومت اس بات کی حق دار نہیں ہے کہ یہاں کے مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کا مطالبہ کر سکے تو کیا یہاں کے مذہبی اور دینی اداروں اور انجمنوں میں سے کسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ مسلمانوں سے عشر و زکوٰۃ کی تحصیل کر سکے؟ اس سوال کا جواب مولانا یہ دیتے ہیں:

''عام اداروں کو ولایتِ عامہ حاصل نہیں ہے اس لیے ان کو فقراء مجہولین کا قائم مقام نہیں کہہ سکتے' صرف زکوٰۃ دینے والوں کا نائب کہہ سکتے ہیں' کیونکہ وہ تو معلوم ہیں۔ پس ان کے قبضہ کو قبضۂ فقراء نہیں کہا جا سکتا' اور ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ کی رقم پہنچنے سے زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی جب تک فقراء کے قبضہ میں نہ پہنچ جائے۔ اگر یہ ادارے یا ان کے عاملین زکوٰۃ میں سے سفر خرچ وغیرہ نکالیں گے تو زکوٰۃ پوری ادا نہ ہوگی' ادھوری ہوگی۔ پس جو ادارے زکوٰۃ کی تحصیل وصول کے لیے کھڑے ہوں ان کو ولایتِ عامہ حاصل کرنا چاہیے' جس کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ حکومت کی طرف سے ان کو یہ حق دیا جائے' یا پھر عامۃ المسلمین باتفاق ان کو یہ حق دے دیں۔ کیونکہ عامۃ المسلمین بھی حکومت کے قائم مقام ہو جاتے ہیں' مگر عامۃ المسلمین کا کسی ادارہ پر اتفاق بہت دشوار ہے۔''

مولانا کے ان ارشادات کی روشنی میں زکوٰۃ کے مصارف اور اس کی وصول تحصیل سے متعلق جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ بالاجمال مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) زکوٰۃ کی رقم سے غرباء کی اجتماعی خدمت و بہبود کا کوئی چھوٹا یا بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً آپ اس سے غریبوں کے محلہ میں کوئی مسجد نہیں بنا سکتے' ان کے لیے تعلیم دین کا کوئی ادارہ نہیں کھول سکتے' ان کی ذہنی اور فکری تربیت کے لیے کوئی اسلامی لائبریری نہیں قائم کر سکتے' ان کے مریضوں کے مفت علاج کے لیے کوئی شفاخانہ نہیں بنا سکتے' غریبوں کے کسی محلہ میں اگر کنواں نہیں ہے تو ان کے پانی پینے کے لیے آپ کنواں بھی نہیں بنوا سکتے' مسافروں کے لیے کوئی سرائے یا تالاب بھی نہیں بنا سکتے۔ الغرض اس قسم کا کوئی کام جو اجتماعی نوعیت رکھتا ہو' خواہ وہ سو فی صدی غریبوں ہی کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو' آپ اس کو زکوٰۃ کی مد سے نہیں کر سکتے' کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے شرط ہے کہ کسی معین مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنا دیا جائے۔ مذکورہ صورتوں میں یہ شرط مفقود ہے' کیونکہ ان میں فائدہ بہت سے غریبوں کے درمیان مشترک ہو گیا ہے' اس وجہ سے تملیک نہیں پائی گئی۔

(۲) آپ اس زکوٰۃ کی رقم سے کسی غریب کی لاش ٹھکانے لگانے کا انتظام بھی نہیں کر سکتے' کیونکہ وہ غریب مر جانے کے سبب سے اس قابل تو رہا نہیں کہ اس مال کو اپنے قبضہ میں لے کر اپنے کفن اور دوسرے سامانِ تجہیز و تدفین کا انتظام کر سکے' اور تملیکِ فقیر کی شرط جو ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے' پوری ہو سکے' اس وجہ سے زکوٰۃ کی مد سے اس کی تجہیز و تکفین نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح آپ کسی مُردہ غریب کا قرضہ بھی زکوٰۃ کی رقم سے ادا نہیں کر سکتے اور نہ ہی کسی غلام کو خرید کر آزاد کر سکتے ہیں' کیونکہ ہر چند یہ کام غریبوں کی بڑی خدمت کے ہیں' لیکن تملیکِ فقیر جو ادائے زکوٰۃ کے لیے شرطِ ضروری ہے' ان دونوں صورتوں میں بھی مفقود ہے۔ [مؤخر الذکر چیز کے ناجائز ہونے کی ایک اور وجہ بھی بیان کی جاتی ہے جس پر ہم آگے بحث کریں گے۔]

(۳) کوئی پبلک انجمن یا ادارہ' خواہ اس کی دینی حیثیت کتنی ہی مسلّم کیوں نہ ہو' تحصیلِ زکوٰۃ کا مجاز نہیں ہے۔ اگر کوئی دینی ادارہ یا انجمن اس کام کو کرے تو وہ وصول کردہ زکوٰۃ میں سے ایک پیسہ بھی اس کی وصولی کے مصارف پر خرچ نہیں کر سکتا' ورنہ اس کے بقدر زکوٰۃ ادا کرنے والوں کی زکوٰۃ ادا نہ ہو گی۔ اس کے لیے جائز صورت صرف یہ ہے کہ ایک طرف وہ زکوٰۃ دینے والوں سے زکوٰۃ وصول کرے' دوسری طرف غریبوں کو اس کا مالک بناتا جائے۔ یا پھر اگر وہ اس رقم کو غریبوں کی تعلیم یا دوسری ضروریات پر اجتماعی طریقے سے خرچ کرنا چاہے تو پھر اس حیلہ سے کام لے جو عموماً ہمارے مدرسوں میں کیا جاتا ہے' یعنی پہلے زکوٰۃ کسی

غریب طالب علم کو دلوائے اور پھر اس طالب علم پر دباؤ ڈال کر اس سے مدرسے یا انجمن کے فنڈ میں وہی رقم بطور عطیہ وصول کر لے۔

(۴) دینی انجمنوں کے لیے اصلی جائز راستہ صرف یہ ہے کہ وہ حکومت سے یا عامۂ مسلمین سے غریبوں کی ولایتِ عامہ کا حق حاصل کریں۔ لیکن افسوس ہے کہ پاکستان میں اس چیز کے حاصل کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے' کیونکہ پاکستان کی حکومت کو' جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے' خود ولایتِ عامہ حاصل نہیں ہے' تو جو چیز اس کو خود حاصل نہیں ہے وہ چیز وہ کسی دوسرے کو کس طرح بخش سکتی ہے؟ رہے جمہور مسلمین تو ان کے بارے میں خود مولانا ہی نے بالکل صحیح فرمادیا ہے کہ ان کا کسی ادارہ پر اتفاق بہت دشوار ہے۔

(۵) پاکستان میں ادائیگیٔ زکوٰۃ کی معیاری شکل صرف یہ ہے کہ ہر صاحبِ زکوٰۃ اپنی زکوٰۃ خود نکالے اور خود کسی مستحق کو تلاش کر کے اس کو اس کا مالک بنادے۔

ان ساری باتوں کی بنیاد فقہ حنفی پر بتائی جاتی ہے اور فقہ حنفی کے متعلق عام تصور (اور خود ہمارا تصور بھی) یہ ہے کہ وہ اجتماعی اور سیاسی پہلو سے دوسری فقہوں کے مقابل میں عقل سے قریب تر ہے۔ لیکن زکوٰۃ سے متعلق اس کے ترجمانوں نے یہ تصورات جو دیے ہیں مَیں نہیں سمجھتا کہ ان پر کسی شخص کا قلب بھی پوری طرح مطمئن ہوسکتا ہے۔ زکوٰۃ اسلامی معاشرے کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن اگر یہ واقعہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کوئی اجتماعی نوعیت کا کام نہیں کیا جاسکتا اور غریبوں کی مجموعی بہبود کی اسکیمیں اس سے بروئے کار نہیں لائی جاسکتیں' بلکہ ختم کی دیگ کی طرح اس کا وہیں تقسیم کر دیا جانا لازمی ہے جہاں یہ پکائی گئی ہے تو اس کی افادیت کم از کم موجودہ زمانہ کے اقتصادی ماحول میں تو بمنزلۂ صفر ہو کے رہ جاتی ہے۔ پھر ایک غور وفکر کرنے والا آدمی یہ سوچ کے بھی حیران رہ جاتا ہے کہ زکوٰۃ کے ذریعہ سے نیکی اور خدمتِ خلق کے وہ کام بھی انجام نہیں دیے جاسکتے جن میں سے بعض کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ یہاں تک کہ کسی غریب کی تجہیز وتکفین بھی اس سے عمل میں نہیں آسکتی۔ آگے چل کر اس سے زیادہ حیران کن صورتِ حال یہ سامنے آتی ہے کہ ایک طرف تو اسلام زکوٰۃ کے معاملہ میں اجتماعیت پر اس درجہ زور دیتا ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں کم از کم اموالِ ظاہرہ کی حد تک کسی شخص کا انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ ادا کرنا سرے سے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ یا دوسری طرف اسلامی حکومت موجود نہ ہونے کی صورت میں یہ حال ہو جائے کہ ہر شخص کے لیے انفرادی طور پر اپنی زکوٰۃ ادا کرنا ہی ایک معیاری طریقہ رہ جائے اور اعلیٰ کے موجود نہ ہونے

کے غصہ میں اعلیٰ سے قریب تر شکلوں کا اہتمام بھی چھوڑ دیا جائے۔

یہ باتیں ایک عام آدمی کے ذہن میں سخت تشویش اور الجھن پیدا کرتی ہیں۔ بالخصوص جب وہ یہ معلوم کرتا ہے کہ صدقات کی رقوم کو کسی عمدہ اجتماعی کام پر صرف کرنے کا اس کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں ہے کہ ایک نہایت بدنما حیلے کی آڑ لی جائے' تو خود شریعت کے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس وجہ سے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے۔ اگر فی الواقع دین میں اس کی کوئی بنیاد ہے تو وہ بنیاد معلوم کی جائے جس پر یہ پوری عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اور اگر یہ ایک بے بنیاد چیز ہے تو اس کی بے حقیقتی واضح کر دی جائے' تاکہ بلاوجہ شریعت کے متعلق کسی کے دل میں بدگمانی پیدا نہ ہو۔

تملیکِ شخصی کے نظریہ کی حقیقت

زکوٰۃ کے مصرف اور اس کی وصولی سے متعلق یہ سارے نظریات درحقیقت فرع ہیں ''تملیکِ فقیر'' یا بالفاظِ دیگر ''تملیکِ شخصی'' کے نظریہ کی۔ ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ کسی محتاج اور غریب کو اُس کا مالک بنایا جائے' اس قسم کی تملیک کے بغیر زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ اس چیز کو ادائیگیٔ زکوٰۃ کی ضروری شرط بلکہ رکنِ زکوٰۃ تسلیم کر لینے سے وہ نتائج آپ سے آپ پیدا ہوتے ہیں جن کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اس وجہ سے سب سے مقدم یہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ یہ نظریہ کس دلیلِ شرعی پر قائم ہے۔

اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں تملیک کا ذکر آتا ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ مسائل پیدا ہوئے ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ لیکن مجھے تلاش کے باوجود کہیں اس مسئلہ پر کوئی ایسی بحث نہیں ملی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس کا ماخذ کتاب وسنت کے اندر کیا ہے' کن تقاضوں سے یہ وجود میں آیا ہے اور کب سے اس نے فقہ حنفی کے اندر ایک مسلمہ کی حیثیت حاصل کر لی' یہاں تک کہ اس کے متعلق اجماع تک کا دعویٰ کیا جانے لگا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شریعت میں کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کتاب اور سنت کے اندر اس کی کوئی اصل ہو۔ بغیر اس قسم کی کسی اصل کے کسی چیز کو کسی چیز کا رکن قرار دے دینا دین میں ایک اضافہ ہے جس کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تملیک کے حق میں اس قسم کی کوئی دلیل قرآن یا حدیث سے ملتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں مَیں صاحب شرح العنایہ علی الہدایہ کا ایک نوٹ نقل کرتا ہوں جو

انہوں نے صاحبِ ہدایہ کے اس دعویٰ کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تملیک رکنِ زکوٰۃ ہے۔ اس نوٹ سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ یہ نظریہ کتاب وسنت کی کسی دلیل کے اوپر مبنی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ صاحبِ شرح العنایہ فرماتے ہیں:

لان الاصل فی دفع الزکوٰۃ تملیك فقیر مسلم غیر هاشمی ولا مولاه جزأ من المال مع قطع منفعة المدفوع عن نفسه مقرونا بالنية ۔ ولقائل ان يقول قولكم التمليك ركن دعوى مجردة اذ ليس فى الادلة النقلية المنقولة فى هذا الباب ما يدل على ذالك خلا قوله تعالىٰ ..... اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ..... وانتم جعلتم اللام للعاقبة دون التمليك۔ والجواب ان معنى قولهم للعاقبة ان المقبوض يصير ملكا لهم فى العاقبة فهم مصارف ابتداً لا مستحقون ثم يحصل لهم الملك فى العاقبة بدلالة اللام فلم تبق دعوى مجردة (حاشیہ فتح القدیر، جلد ثانی، ص ۲۰)

''کیونکہ ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے اصلی چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے مال کے کچھ حصہ کا کسی مسلمان محتاج کو، جو ہاشمی یا کسی ہاشمی کا آزاد کردہ غلام نہ ہو، ادائیگیٔ زکوٰۃ کی نیت کے ساتھ اس طرح مالک بنا دے کہ خود اپنی کوئی غرض اس ادا کردہ مال کے ساتھ وابستہ نہ رکھے۔ ایک معترض اس پر یہ کہہ سکتا ہے کہ تمہارا یہ کہنا کہ تملیک ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے، محض ایک خالی خولی دعویٰ ہے، کیونکہ زکوٰۃ کے سلسلہ میں جو نقلی دلیلیں وارد ہیں ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ملتی جس سے اس دعویٰ کا ثبوت مہیا ہوتا ہو۔ لے دے کر اس باب میں جو چیز دلیل کی حیثیت رکھتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے کہ: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ۔ لیکن اس کا حال بھی یہ ہے کہ تم (یعنی حنفیہ) لِلْفُقَرَآءِ کے ''لام'' کو عاقبت کے معنی میں لیتے ہو، تملیک کے معنی میں نہیں لیتے۔ جواب اس اعتراض کا یہ ہے کہ ''لام'' کو جو ہم عاقبت کے معنی میں لیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مقبوضہ مال آخر کار ان کی ملک بن جائے گا۔ پس اپنی ابتدائی حیثیت میں تو یہاں فقراء اور مساکین کا ذکر مصارفِ زکوٰۃ بیان کرنے کے پہلو سے ہوا ہے، مستحقین کی حیثیت سے نہیں ہوا ہے، لیکن ''لام'' اس بات پر دلیل ہے کہ بالآخران کو ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ پس تملیک کا دعویٰ محض دعویٰ ہی دعویٰ نہیں رہا۔''

اس نوٹ کو بغور پڑھیے۔ یہ ایک ایسے بلند مرتبہ حنفی عالم کے قلم سے نکلا ہے جنہوں نے

''ہدایہ'' جیسی بلند پایہ کتاب پر حاشیہ لکھا ہے۔ ان کا اپنا اعتراف یہ ہے کہ تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی کوئی نقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ لے دے کر اگر کسی چیز کو دلیل کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے تو وہ ایک لام ہے جو اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والی آیت میں لفظ ''فقراء'' پر داخل ہے۔ اس ''لام'' کا بھی حال یہ ہے کہ احناف اس کو غالباً شوافع کے استدلال سے بچنے کے لیے تملیک یا استحقاق کے معنی میں نہیں لیتے' بلکہ عاقبت کے معنی میں لیتے ہیں۔ [اس ''لام'' پر مفصل بحث آگے آ رہی ہے۔ وہیں اس کے بارے میں احناف اور دوسرے ائمہ کے مذاہب پر ہم روشنی ڈالیں گے۔] اوّل تو اس ''لام'' کو عاقبت کے معنی میں لینے کا کوئی تک نہیں ہے' لیکن اگر کوئی شخص اس معنی میں اس کو لے بھی تو بہر حال اس سے تملیک کا مفہوم تو کسی طرح بھی نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ اگر بہت تکلف سے کام لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں لام عاقبت لینے کے بعد بھی یہ آیت تملیک کے مفہوم کے خلاف نہیں جاتی اور یہی ان بزرگ عالم نے فرمایا بھی ہے۔ لیکن اتنی بات کچھ بھی مفید طلب نہیں ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی کتاب وسنت سے کیا دلیل ہے؟ اگر اس کی کوئی دلیل موجود ہے تو ہم بڑے شوق سے یہ مان لیں گے کہ اس لام کو عاقبت کے معنی میں لینے سے بھی کوئی خاص حرج واقع نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اصل دعویٰ ثابت نہ ہو تو محض لام عاقبت کی اس توجیہہ سے اصل بحث کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ تملیک کا دعویٰ تو اصل توجیہہ کے بعد بھی محض دعویٰ ہی دعویٰ رہا۔

لام تملیک سے استدلال کی حقیقت

حنفیہ اگرچہ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والی آیت میں ''لام'' کو تملیک کے معنی میں نہیں لیتے اس وجہ سے اس سے ان کے ہاں تملیک پر استدلال کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا' لیکن یہ ''لام'' بہر حال ایک بنائے بحث بن سکتا ہے اور اس سے ایک شخص تملیک پر استدلال کر سکتا ہے' جیسا کہ امام شافعی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس سے تملیک پر استدلال کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ لام تملیک کے مفہوم کے لیے ایسا نصِ قطعی ہے کہ تملیک کو ادائے زکوٰۃ کے لیے ایک رکن کی حیثیت دے دی جائے جس کے بغیر زکوٰۃ ادا ہی نہ ہو سکے اور اس کے نتیجہ میں وہ سارے مسائل پیدا کر ڈالے جائیں جن کا صدر مضمون میں ہم نے حوالہ دیا ہے اور جن کے سبب سے زکوٰۃ جیسی اہم چیز کی ساری افادیت بالکل ختم ہو کے رہ جاتی ہے۔

میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اس ''لام'' کو تملیک کے مفہوم کے لیے خاص کر دینا ایک

نہایت کمزور بات ہے۔ عربی زبان میں یہ حرف کچھ ایک ہی معنی کے لیے نہیں آتا کہ اس سے حاصل شدہ مفہوم کو شرط اور رکن کا مرتبہ دے دیا جائے۔ حروف کی بحث میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور نحوی شیخ جمال الدین ابن ہشام انصاری کی ''مغنی اللبیب'' ایک مستند ترین کتاب ہے۔ اس فاضل نے غالباً مکہ میں بیٹھ کر یہ کتاب لکھی ہی اس غرض سے تھی کہ یہ قرآن وحدیث کی نحوی مشکلات کے حل کرنے میں رہنمائی کر سکے۔ انہوں نے ''لام'' کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ ۲۲ معنوں کے لیے آتا ہے۔ ان تمام معانی کی تفصیل نقل کرنا تو یہاں مشکل ہے اور غیر ضروری بھی' لیکن اس کے چند معانی کتابِ مذکور سے ہم یہاں درج کرتے ہیں' تاکہ اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکے اور جو لوگ اس کو تملیک کے معنی کے لیے ایک نصِ قطعی بتا رہے ہیں ان کی غلطی واضح ہو سکے۔ علامہ موصوف نے اس حرف کے جو معانی بتائے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) استحقاق کے معنی کے لیے' مثلاً: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ (شکر حقیقی کا حق دار اللہ ہی ہے)' وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ (ماپ تول میں کمی کرنے والے ویل کے مستحق ہیں)

(۲) اختصاص کے معنی کے لیے' مثلاً: اَلْجَنَّةُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ (جنت اہل ایمان کے لیے خاص ہے)

(۳) ملکیت کے مفہوم کے لیے' مثلاً: لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)

(۴) تملیک کے معنی کے لیے' مثلاً: وَهَبْتُ لِزَيْدٍ دِيْنَارًا (میں نے زید کو ایک دینار ہبہ کر دیا)

(۵) تملیک سے ملتے جلتے مفہوم کے لیے' مثلاً: جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (اور تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں)

اوپر ضمناً لامِ عاقبت بھی زیر بحث آ چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کی نوعیت بھی معلوم کر لیجیے۔ سترہویں نمبر پر اس کا ذکر اس طرح آتا ہے: ''لام صیرورۃ جس کو لامِ عاقبت اور لامِ مآل بھی کہتے ہیں۔ مثلاً: فَالْتَقَطَهٗ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (اور اس کو (موسیٰ کو) فرعون کے گھر والوں نے دریا سے نکال لیا' تاکہ وہ ان کے لیے دشمن اور غم کا کانٹا بنے)''۔

یہ لامِ جر کے ۲۲ معنوں میں سے ہم نے صرف چند کا حوالہ دیا ہے۔ اس سے اس کی

وسعت کا اندازہ کیجیے۔ اور ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ صاحب مغنی اللبیب حتی الوسع ہر مفہوم کی مثالیں قرآن وحدیث سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں' لیکن تملیک کے مفہوم کی وضاحت کے لیے انہوں نے قرآن کی کوئی مثال دینے کے بجائے عربی زبان کا ایک عام فقرہ ''وَهَبْتُ لِزَيْدٍ دِينَارًا'' نقل کر دیا ہے۔ اگر آیت ''اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ'' کی ''لام'' تملیک کے مفہوم کے لیے کوئی واضح اور قطعی چیز ہوتی تو ابن ہشام کے ذوق کے یہ بات بالکل خلاف تھی کہ وہ قرآن کی ایک مثال نظر انداز کر کے ایک کمتر درجہ کی مثال پیش کرتے۔

بہر حال تملیک کے نظریہ کی عمارت اگر لِلْفُقَرَآءِ کی لام ہی پر کھڑی ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ بنیاد نہایت کمزور ہے۔ اوّل تو اس کے مفہوم ہی کے بارہ میں بڑے اختلافات ہیں۔ احناف اس کو لامِ عاقبت کے معنی میں لیتے ہیں' جیسا کہ شارح ہدایہ کے اس نوٹ سے مترشح ہوتا ہے جس کا اوپر ہم نے حوالہ دیا ہے۔ مالکیہ اس کو لامِ اجل کے مفہوم میں لیتے ہیں' جیسا کہ قاضی ابن عربی نے احکام القرآن میں بتصریح لکھا ہے۔ صرف امام شافعی کے متعلق یہ تصریح ملتی ہے کہ وہ اس کو تملیک کے معنی میں لیتے ہیں۔ ثانیاً اگر یہ اختلاف نہ بھی ہوتا جب بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ آیت میں تملیک کے مفہوم کی بھی گنجائش نکلتی ہے۔ اور اس کی حیثیت محض ایک استنباط کی ہوتی' نہ کہ ایک نص قطعی کی جس کی بنا پر تملیک کو ادائے زکوٰۃ کے لیے رکن یا شرطِ لازم قرار دے دیا جائے۔

میرے نزدیک یہاں لام یا تو استحقاق و اختصاص کے مفہوم کے لیے ہے یا انتفاع و افادہ کے مفہوم کے لیے' تملیک کے مفہوم کے لیے ہرگز نہیں ہے۔ سیاق و سباقِ کلام اس مفہوم سے ابا کرتا ہے۔

سب سے پہلے نظمِ کلام کی روشنی میں اس مسئلہ پر غور کیجیے۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والی آیت جس سیاق و سباق میں ہے وہ یہ ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ

عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾ (التوبۃ)

''اوران منافقین میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو تمہیں صدقات کی تقسیم کے بارہ میں متہم کرتے ہیں۔ اگر اس میں سے انہیں بھی ان کی خواہش کے بقدر دیا جائے تو راضی رہتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے تو بگڑ بیٹھتے ہیں' حالانکہ اگر وہ اس پر قناعت کرتے جو اللہ اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے' اللہ اپنے فضل سے ہمیں نوازے گا اور اس کا رسول بھی ہمیں عطا فرمائے گا' ہم تو اللہ ہی سے لو لگائے ہوئے ہیں (تو یہ بات ان کے حق میں بہتر ہوتی)۔ خیرات کا مال تو بس فقیروں کا حق ہے اور محتاجوں کا اور اُن کارکنوں کا جو مالِ خیرات کے وصول کرنے پر تعینات ہیں اور اُن لوگوں کا جن کے دلوں کا پرچانا منظور ہے' نیز گردنیں چھڑانے میں اور زیر باروں کے قرضہ میں اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی ضروریات میں (اس کو خرچ کیا جائے)۔ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔''

دیکھئے' یہاں اوپر والی آیت میں ذکر اُن منافقین کا تھا جن کا نبی ﷺ کے ساتھ حسنِ ظن اور سوءِ ظن تمام تر اغراض پر مبنی تھا۔ اگر خیرات کے مال میں سے ان کی خواہش کے بقدر انہیں مل جاتا تو نبی ﷺ کی خوب خوب تعریفیں کرتے اور خواہش کے بقدر نہ ملتا تو آپ کو متہم کرنے سے بھی باز نہ رہتے' آپ پر بے جا جانبداری اور ناروا پاسداری کا الزام لگاتے اور طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کرتے۔ غور کیجیے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات کیا ہوسکتی ہے؟ یہ کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے کسی فقیر کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے یا یہ کہ زکوٰۃ و خیرات کی رقموں کے اصلی حق دار اور مستحق فلاں فلاں قسم کے لوگ ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سیاق میں بتانے کی بات یہ دوسری ہی ہوسکتی ہے نہ کہ پہلی۔ چنانچہ مفسرین میں سے جن لوگوں کی نظر سیاق و سباق پر رہتی ہے انہوں نے آیت کی یہی تاویل کی بھی ہے۔ صاحب کشاف اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قصر لجنس الصدقات علی الاصناف المعدودة وانها مختصة بها لا تتجاوزها الی غیرها کانه قیل انما هی لهم لا لغیرهم ونحوه قولك انما الخلافة لقریش ترید لا تتعداهم ولا تکون لغیرهم

''یہاں زکوٰۃ و صدقات کو مذکورہ اقسام پر محدود کر دیا گیا ہے اور یہ کہ یہ انہی کے لیے خاص ہے' دوسروں کی طرف یہ چیز منتقل نہیں ہوسکتی۔ گویا یہ بات کہی گئی کہ یہ چیز انہی

کے لیے ہے' ان کے ماسوا لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ تم کہو کہ انما الخلافة لقریش (خلافت تو بس قریش کے لیے ہے) یعنی یہ ان کے سوا دوسروں کا حق نہیں ہے۔''

پس ''لام'' یہاں جس چیز کو ظاہر کر رہا ہے وہ صرف خیرات وصدقات کا مذکورہ اصناف کے لیے خاص ہونا ظاہر کر رہا ہے' نہ تملیک کے معاملہ سے اس کو کوئی تعلق ہے اور نہ اس مسئلہ سے اس کو کوئی واسطہ ہے کہ یہ تمام اصناف بیک وقت اس کی حق دار ہیں' یا ان میں سے مصلحت کے تحت کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی جاسکتی ہے یا ان میں سے کسی ایک ہی کو اس کا مصرف بنایا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد آیت کی اندرونی تالیف پر غور کر کے دیکھئے کہ خود اس کے مختلف اجزاء کی باہمی مناسبت کا تقاضا کیا ہے۔ آیت کے اندر' جیسا کہ بالکل واضح ہے' آٹھ اصناف کا بحیثیت مصارفِ خیر کے ذکر ہے' جن میں سے ابتدائی چار کا ذکر ''لام'' کے تحت ہے اور چار کا ذکر ''فِیْ'' کے تحت۔ ظاہر ہے کہ کلام میں یہاں کوئی ایسی ہی تقدیر ماننا مناسب ہوگا جو ''لام'' کے ساتھ بھی مربوط ہو سکے اور ''فِیْ'' کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہو سکے۔ اگر لام کو تملیک کے معنی میں لیجیے تو آیت کا ابتدائی حصہ اس کے آخری حصہ سے بالکل ہی بے ربط ہو کے رہ جائے گا' کیونکہ فِیْ میں بہرحال تملیکیت کا کوئی مفہوم نہیں پایا جاتا۔ اگر اس کے اندر پایا جاتا ہے تو افادیت اور خدمت ومصلحت کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ((مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْهِ)) ''جب تک کہ ایک مسلمان اپنے بھائی کے کام میں یا اس کے مصالح کی خدمت میں رہتا ہے''۔ پس آیت کے دونوں حصوں کی ہم آہنگی کا اقتضاء یہ ہے کہ یہاں لام کو استحقاق یا انتفاع کے مفہوم میں لیا جائے تاکہ ایک ہی تقدیر کے تحت پوری آیت کی تاویل ہو سکے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا' بلکہ لام میں تملیک کا مفہوم لیا گیا' تو آخری چار اصناف کے ساتھ تملیکیت کا مفہوم جوڑنے کے لیے کلام کی وسعت اور اس کی بلاغت کو بالکل ذبح کر دینا پڑے گا' جیسا کہ فی الواقع کیا بھی گیا ہے اور جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس ادبی نکتہ کی طرف ابن منیر نے کشاف کے حاشیہ الانتصاف میں توجہ دلائی ہے:

فاما ان یکون التقدیر انما الصدقات مصروفة للفقراء کقول مالك او مملوکة کقول الشافعی لکن الاول متعین لانه تقدیر یکتفی به فی الحرفین (الانتصاف حاشیہ کشاف لابن منیر)

''اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ میں تقدیر کلام یا تو یہ ہوگی کہ صدقات فقراء کے لیے صرف کیے جائیں گے' جیسا کہ امام مالک کہتے ہیں' یا یہ ہوگی کہ صدقات فقراء کی ملکیت ہیں' جیسا کہ امام شافعی کا قول ہے' لیکن یہاں پہلی تقدیر متعین ہو جاتی ہے' کیونکہ یہ دونوں حرفوں (ل اور فی) کے ساتھ یکساں طور پر ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔''

تملیک کی بعض دوسری دلیلیں

اس لام کے علاوہ مجھے فقہ کی مشہور و متداول کتابوں میں تملیک کے رکنِ زکوٰۃ ہونے کی کوئی دلیل باوجود تلاش کے نہیں ملی' اور اگر ملی بھی ہے تو اس کا تملیک کی دلیل ہونا کم از کم اس عاجز پر کسی پہلو سے بھی واضح نہیں ہو سکا۔ تاہم چونکہ اسی طرح کی بعض مبہم چیزوں کو بطورِ دلیل پیش کیا گیا ہے اس وجہ سے میں ان پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالنا چاہتا ہوں۔

مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے بدائع الصنائع کے حوالہ سے تملیک کی مندرجۂ ذیل دلیلیں اپنے مضمون میں نقل فرمائی ہیں:

وقد امر الله تعالى الملاك بايتاءِ الزكوةِ بقوله عزوجل وَاٰتُوا الزَّكٰوة والايتاء هو التمليك ولذا سمى الله تعالى الزَّكٰوةَ صدقة بقوله اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ والتصدق تمليك

''اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم وَاٰتُوا الزَّکٰوۃ کے ذریعہ سے مالکینِ نصاب کو زکوٰۃ دینے کا حکم دیا ہے اور ''ایتاء'' تملیک ہی ہے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ کا نام صدقہ رکھا ہے۔ ارشاد ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اور تصدق وہی تملیک ہے۔''

دوسری جگہ ہے:

واما ركنه فهو التمليك لقوله تعالى وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ والايتاء هو التمليك (بدائع الصنائع' ج۲' ص ٦٥)

''رہا زکوٰۃ کا رکن تو وہ تملیک ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (اور اس کی کٹائی کے وقت اس کا حق دو) یہاں ایتاء سے مقصود وہی تملیک ہے۔''

تملیک کی تائید میں جن نصوص کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:

واما النص فقوله تعالى اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وقوله عزوجل وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ' والاضافة بحرف اللام

تقتضی الاختصاص بجهة الملك اذا كان المضاف اليه من اهل الملك (بدائع' ج ۲' ص ٤'٥)

''رہا تملیک کے ثبوت میں نص تو اللہ تعالیٰ کا قول : اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ (خیرات کا مال تو بس غریبوں کے لیے ہے) ہے۔ اور دوسری آیت ہے وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کے لیے ایک متعین حق ہے)۔ حرفِ لام کے ذریعہ سے جب اضافت ہو تو وہ ملکیت کے پہلو سے اختصاص کو چاہتی ہے بشرطیکہ مضاف الیہ اہل ملک میں سے ہو''۔

بس یہی دلیلیں ہیں جو تملیک کی تائید میں فقہ کی مختلف کتابوں میں دہرا دہرا کر پیش کی گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ 'ایتاء' اور 'تصدق' کے الفاظ کی حقیقت ہی تملیک ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ لِلْفُقَرَآءِ اور لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ میں جو لام ہے وہ اختصاصِ ملک کا مقتضی ہے اگر مضاف الیہ اہلِ ملک میں سے ہو۔

جہاں تک پہلی دلیل کا تعلق ہے' یہ گزارش ہے کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ 'ایتاء' اور 'تصدق' کے الفاظ میں بعض جگہ تملیک کا مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے' لیکن اس میں بہت کچھ دخل قرینہ اور سیاق وسباق کو ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ ان الفاظ ہی کے اندر تملیک کا مفہوم داخل ہو اور جب یہ بولے جائیں تو تملیک کا مفہوم ان کے اندر سے آپ ہی آپ نکل آئے۔ اگر ایسا ہوتا تب تو بلاشبہ ان کو تملیک کے ثبوت میں بطور نص کے پیش کیا جا سکتا تھا' لیکن یہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے کہ ایسا نہیں ہے' ورنہ ہمیں اٰتَیْنَاهُمُ الْكِتٰبَ (ہم نے ان کو کتاب دی) اور وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی) میں بھی تملیک کا مفہوم لینا پڑے گا' حالانکہ ان میں اور اس طرح کے بے شمار استعمالات میں تملیک کے مفہوم کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ پس دیکھنا یہ ہے کہ جہاں جہاں قرآن یا حدیث میں یہ الفاظ ادائے زکوٰۃ وخیرات کے لیے بولے گئے ہیں وہاں بے تکلف تملیک کی طرف ذہن جاتا ہے یا نہیں۔ میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی ''اٰتُوا الزَّکٰوۃ'' یا 'تَصَدَّقُوْا'' وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں وہاں متبادر مفہوم ان الفاظ کا صرف یہی ہے کہ زکوٰۃ دو اور صدقہ دو۔ سارا زور صدقہ اور زکوٰۃ ادا کرنے پر ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ ادائیگی تملیکِ فقیر کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔ یہ چیز اٰتُوْا اور تَصَدَّقُوْا کے الفاظ سے نہیں نکلتی۔ اگر اس کی کوئی

اور دلیل ہو تو اس پر غور کیا جا سکتا ہے' لیکن محض اٰتُوا اور تَصَدَّقُوا کے سہارے پر تملیک کو ادائیگیٔ زکوٰۃ کا رکن نہیں قرار دیا جا سکتا۔

چند مثالیں میں قرآن سے پیش کرتا ہوں' ان کو ملاحظہ فرمائیے:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ ؕ﴾ (التوبۃ:۵)

''پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔''

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ﴾ (الحج:۴۱)

''جن کا حال یہ ہے کہ اگر ہم ملک میں ان کو اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔''

﴿وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَا اٰتَوْا وَّقُلُوْبُھُمْ وَجِلَۃٌ﴾ (المؤمنون:۶۰)

''اور جن کا حال یہ ہے کہ وہ جو کچھ خدا کی راہ میں دیتے ہیں اس کو خدا سے ڈرتے ہوئے دیتے ہیں۔''

یہ چند آیتیں ہم نے بغیر کسی انتخاب کے نقل کر دی ہیں' ان کو خالی الذہن ہو کر پڑھیے اور پھر غور کیجیے کہ ان میں سارا زور زکوٰۃ کے ادا کرنے کے مفہوم پر ہے یا تملیکِ فقیر کے وجوب پر؟ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ یہ بتانا چاہتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد اُن سے تعرض نہ کیا جائے یا یہ بتانا چاہتا ہے کہ جب تک یہ تملیکِ فقیر نہ کر دیں ان کا پیچھا نہ چھوڑا جائے؟ اسی طرح تیسری آیت پر نگاہ ڈالیے۔ اس میں ''ایتاء'' کا لفظ موجود ہے' لیکن اس سے مقصود ان لوگوں کی انفاق فی سبیل اللہ کی خصلت کا اظہار ہے یا اس بات کا اظہار کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے تملیکِ فقیر کیا کرتے ہیں؟ [یہ لفظ متعدد جگہ قرآن میں تملیک اجتماعی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔]

اب آیئے دو آیتیں 'تصدق' سے متعلق بھی ملاحظہ فرمائیے:

﴿فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ﴾ (المنٰفقون)

''پس میں صدقہ کرتا اور نیکوکاروں میں سے بنتا۔''

فرمائیے اس کا مطلب یہ ہے کہ میں مختلف طریقوں سے اللہ کی راہ میں اور غرباء کی بہبود کے کاموں میں فیاضی کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتا یا یہ ہے کہ میں تملیکِ فقیر کیا کرتا؟

﴿وَمِنْھُمْ مَّنْ عٰھَدَ اللّٰہَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِہٖ لَنَصَّدَّقَنَّ﴾ (التوبۃ:۷۵)

''ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے ہم کو اپنے

فضل سے نوازا تو ہم صدقہ کیا کریں گے۔''

فرمائیے کہ اس قول کے قائلین کے ذہن میں یہ مضمون تھا کہ اگر ہمیں مال ملا تو ہم تملیکِ فقیر کیا کریں گے یا یہ مقصد تھا کہ اگر ہم کو مال ملا تو ہم اللہ کے راستے میں مختلف طریقوں سے خرچ کریں گے؟ قطع نظر اس سے کہ تملیک ہو یا نہ ہو۔

ان مثالوں کے ذکر سے ہمارا مقصد محض اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ 'ایتاء' یا 'تصدق' کے الفاظ تملیک کے معنی یا مفہوم کے لیے ایسے قطعی نہیں ہیں کہ آپ ان کو تملیک کے ثبوت میں نص کی حیثیت سے پیش کریں۔ ان سے اصلی چیز جو ظاہر ہوتی ہے وہ دینا یا خرچ کرنا ہے۔ یہ دینا اور خرچ کرنا تملیک کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے اور بغیر اس کے بھی ہو سکتا ہے۔ تملیک پر اس قدر اصرار (اور وہ بھی تملیک کی ایک خاص نوعیت پر) کہ اس کے بغیر زکوٰۃ ادا ہی نہ ہو سکے' یہاں تک کہ کوئی شخص زکوٰۃ کے پیسوں سے کسی غریب میت کے لیے کفن بھی نہ خرید سکے' کسی غریب مُردہ کا قرض بھی ادا نہ کر سکے' میرے نزدیک ایک بالکل بے حقیقت بات ہے۔

دوسری دلیل میں بنائے استدلال تمام تر ''لام'' پر قائم ہے جس کی پوری حقیقت ہم واضح کر چکے ہیں۔ البتہ یہ پہلو اس میں نیا ہے کہ لام کو تملیک کے بجائے اختصاص کے مفہوم میں لے کر اس سے اختصاصِ ملک کا مضمون نکالا گیا ہے اور یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اگر اضافت ''لام'' کے ذریعہ سے ہو اور مضاف الیہ اہل ملک میں سے ہو تو وہ اختصاصِ ملک پر دلیل ہے۔ میرے نزدیک یہ دعویٰ بھی بے بنیاد ہے۔ ہم اَلْفَرَسُ لِلرَّاکِبِ (گھوڑا سوار کے لیے ہے) اور اَلْمِنْبَرُ لِلْخَطِیْبِ (منبر خطیب کے لیے ہے) بولتے ہیں۔ ان میں اضافت بھی لام کے ذریعہ سے ہے اور مضاف الیہ بھی دونوں جملوں میں اہل ملک میں سے ہیں' لیکن ان سے کوئی شخص بھی اختصاصِ ملک نہیں سمجھتا' بلکہ صرف ایک نوعیت کا اختصاص سمجھتا ہے۔ پھر اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ اور فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ میں اختصاصِ ملک کا مضمون کہاں سے آ جائے گا؟ بہرحال اگر اس استدلال کو تھوڑی دیر کے لیے صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک استنباط کی ہوئی۔ اس کا یہ درجہ نہیں ہے کہ اس کو ایک رکنِ دین قرار دے دیا جائے اور جہاں اس کی کسی سے کوئی ادنیٰ قسم کی خلاف ورزی صادر ہوئی تو اس کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ وہ ایک حکمِ شرعی کا منکر ہے۔

کیا ایک مقام کی زکوٰۃ دوسرے مقام پر صرف نہیں ہوسکتی؟

دوسری چیز جو مولانا ظفر احمد صاحب کے مضمون میں نہایت قابل غور اور اہل علم کے فکر و نظر کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اُس کی تقسیم کا معیاری طریقہ صرف یہ ہے کہ محصلینِ زکوٰۃ ہر جگہ کھیتوں' کھلیانوں اور چراگاہوں میں پھیل جائیں' زکوٰۃ وصول کریں اور وہیں غرباء میں تقسیم کر دیں۔ اور جب تک اس علاقہ میں غرباء و مستحقین موجود ہوں دوسری جگہ اس علاقہ کی زکوٰۃ منتقل نہ کریں۔

قطع نظر اس سے کہ موجودہ زمانہ کی حکومتیں جو محاصل کی تشخیص و تحصیل کے معاملہ میں جدید نظریات کی معتقد ہیں اور ہر کام کو منصوبہ بندی کے تحت کرنا پسند کرتی ہیں' اس چیز کو اپنا سکتی ہیں یا نہیں' اس میں دو نہایت واضح قباحتیں ایسی ہیں جن کو ایک عام آدمی بھی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک تو یہ کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو علاقے زیادہ پست حال ہیں وہ برابر پست حال ہی رہیں' کم از کم زکوٰۃ کی مد سے ان کی اصلاح و ترقی میں کوئی قابل ذکر حصہ نہیں لیا جا سکتا' کیونکہ پست حال علاقوں میں قدرتی طور پر زکوٰۃ کی آمدنی بہت تھوڑی ہوگی اور دوسرے علاقوں کی زکوٰۃ ان علاقوں کی امداد کے لیے مشکل ہی سے کچھ منتقل کی جا سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ کوئی حکومت کسی منصوبہ بندی کے تحت اپنی زکوٰۃ کی پوری آمدنی کسی ایسی دُور رَس اور مفید اسکیم پر خرچ نہیں کر سکتی جس سے اس ملک کے پست حالوں اور غریبوں کو بحیثیت مجموعی کوئی مستقل فائدہ پہنچے۔ حالانکہ موجودہ زمانہ منصوبہ بندی کا زمانہ ہے' منصوبہ بندی کے ذریعے سے اگر کوئی حکومت چاہے تو دیکھتے دیکھتے' اپنے انہی ذرائع سے کام لے کر جو منتشر طور پر استعمال ہونے کے سبب سے کوئی مؤثر نتیجہ پیدا نہیں کر رہے ہیں' اپنے ملک کے غریبوں کی کایا پلٹ دے سکتی ہے۔ ہم بات بات پر کہتے ہیں کہ اگر اسلام کا اقتصادی نظام ملک میں جاری ہو جائے تو غریبوں کے آسمان و زمین بدل جائیں گے۔ لیکن اگر غریبوں کے حصہ کی اصلی آمدنی کا یہی حشر ہوا کہ ہر تھانہ کی زکوٰۃ اسی تھانہ میں تقسیم ہو گئی تو اشتراکیت کا مقابلہ کرنا تو الگ رہا' شاید ہم زکوٰۃ کی آمدنی سے غریبوں کی بے شمار مشکلات میں سے کوئی ایک مشکل بھی حل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نبی ﷺ اور صحابہؓ کے زمانہ میں حکومت کی پالیسی عموماً یہی رہی ہے کہ جس جگہ سے زکوٰۃ وصول کی جائے' اگر حقیقی ضرورت وہاں موجود ہو تو وہیں خرچ بھی کر دی جائے' وہاں سے مرکز کو منتقل نہ کی جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ایک انتظامی معاملہ تھا جو

محض وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت عمل میں آیا تھا یا شریعت کا قانون ہی یہی ہے کہ ہر تھانہ بلکہ ہر بستی کی زکوٰۃ اُسی تھانہ اور اُسی بستی میں تقسیم کر دی جائے؟ نہایت واضح دلائل کی روشنی میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ محض ایک انتظامی معاملہ ہے۔ اسلامی حکومت اختیار رکھتی ہے کہ وہ چاہے تو ہر تھانہ اور ہر بستی کی زکوٰۃ اسی تھانہ یا بستی میں تقسیم کرا دے' چاہے تو کسی خاص علاقہ میں (اگر اس علاقہ میں ایمرجنسی کی صورت پیدا ہو گئی ہو) پورے ملک کی زکوٰۃ اکٹھی کر کے خرچ کر دے۔ اور اگر چاہے تو کسی مرکزی اسکیم کے تحت پورے ملک کی زکوٰۃ کنٹرول کر کے اس کو ملک کے غرباء کی کسی نفع بخش اسکیم میں لگا دے' جس سے سب کو فائدہ پہنچے۔

اس کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ اگر مقصود انفرادی تقسیم ہی تھی تو زکوٰۃ کے معاملہ کو حکومت کے ہاتھ میں دینے کا کوئی فائدہ ہی نہیں ہے۔ حکومت کے ہاتھ میں تو دیے ہی وہ معاملات جاتے ہیں جن کے اندر کوئی اجتماعی نوعیت کا تصرف پیش نظر ہو۔ اگر یہ چیز مقصود نہیں تھی تو اوّل تو حکومت کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ سرے سے اس کو ہاتھ میں لیتی ہی نہ' اور اگر لیتی بھی تو بس اس حد تک کہ اس کے عمال ہر جگہ صرف اس بات کی نگرانی کرتے رہتے کہ لوگ اپنی اپنی زکوٰتیں نکالیں اور غرباء میں تقسیم کر دیں۔ اگر لوگ اس میں سست پڑتے نظر آتے تو ان کو ترغیب یا ترہیب سے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے۔

دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر یہ معاملہ محض انتظامی نوعیت کا نہ ہوتا' بلکہ شریعت کا حکم ہی یہ ہوتا کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہ ہو تو کم از کم صدرِ اوّل میں تو اس کا امکان نہیں تھا کہ اس حکم کی خلاف ورزی کی جا سکتی۔ لیکن ہم صاف دیکھتے ہیں کہ نبی ﷺ اور صحابہؓ کے زمانے میں مرکزی حکومت براہِ راست اپنی ہدایات کے تحت زکوٰۃ کو منتقل بھی کراتی ہے اور نہیں بھی کراتی ہے' کبھی اپنا حصہ کچھ مقرر کر لیتی ہے کبھی کچھ کر لیتی ہے' بلا لحاظ اس کے کہ مقامی غرباء کی ضروریات پوری ہو چکی ہیں یا نہیں؟ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں قانون کے تحت سارے اختیارات حکومت کو حاصل ہیں۔ وہ مختلف علاقوں کے حالات اور غرباء کے مصالح کے تحت اس میں ہر قسم کا تصرف کر سکتی ہے۔ ذیل میں ہم اہل علم کے غور کرنے کے لیے اپنے خیال کی تائید میں چند دلیلیں پیش کرتے ہیں۔

جس زمانہ میں مدینہ میں مہاجرین کا مسئلہ اقتصادی نقطۂ نظر سے ایک پیچیدہ مسئلہ بنا ہوا تھا اُس زمانہ میں اطرافِ مدینہ کی زکوٰۃ بڑے اہتمام کے ساتھ وصول کرا کے مدینہ منگوائی جاتی تھی' تاکہ مہاجرین کی مشکلات حل کی جا سکیں۔ یہاں تک کہ ایک اعرابی نے

آنحضرت ﷺ سے وصولیٔ زکوٰۃ کے سلسلہ میں عمال کے رویہ کی سختی کی شکایت کی کہ صدقہ کی ایک بکری کی خاطر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں۔ حضور ﷺ نے اس کے جواب میں اس سختی کے لیے جو وجہ بیان فرمائی وہ یہ تھی کہ:

((لَوْ لَا اَنَّهَا تُعْطٰى فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِيْنَ مَا اَخَذْتُهَا))

(نیل الاوطار' ج ۳' ص ۱۶۱)

''اگر یہ چیز غریب مہاجرین کو نہ دینی ہوتی تو میں اس کو نہ لیتا۔''

جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حوالیٔ مدینہ کی زکوٰۃ وصول کرا کے مدینہ منگوانے کی اصل وجہ یہی تھی کہ مدینہ میں بے سہارا مہاجرین کا مسئلہ ایک پریشان کن مسئلہ بنا ہوا تھا جس کو حکومت کے لیے حل کرنا ضروری تھا۔ یہ وجہ نہ تھی کہ حوالیٔ مدینہ میں زکوٰۃ کے مستحقین موجود ہی نہ تھے۔

اسی مہاجرین کے مسئلہ کے سبب سے اہل یمن کے ساتھ زکوٰۃ کے معاملہ میں دو مختلف زمانوں میں دو مختلف پالیسیاں اختیار کی گئیں۔ جس زمانہ میں مہاجرین کا مسئلہ پیچیدہ بنا ہوا تھا اور غالباً کپڑوں کی ان کے لیے شدید ضرورت تھی' اس زمانہ میں یمن میں آنحضرت ﷺ کے نمائندے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اہل یمن سے اُن کے صدقات کی تمام اصناف و اجناس کے بدلہ میں صرف نئے اور پرانے کپڑے وصول کیے اور وہ سارے کپڑے مہاجرین کے لیے مدینہ روانہ کر دیے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی کم اہم ضروریات کے مقابل میں انہوں نے مہاجرین کی زیادہ اہم ضرورت کو مقدم رکھا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے اعلان کے الفاظ ملاحظہ ہوں جس سے صاف وہ مفہوم نکلتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے:

ایتونی بکل خمیس ولبیس آخذہ منکم مکان الصدقة فانه ارفق بکم وانفع للمهاجرین والانصار بالمدینة (نیل الاوطار' ج ۳' ص ۱۶۱)

''تم میرے پاس ہر قسم کے نئے اور پرانے کپڑے لاؤ' میں صدقہ کے معاوضہ میں ان کو قبول کر لوں گا۔ اس میں تمہیں آسانی ہو جائے گی اور مدینہ کے مہاجرین اور انصار کا بھلا ہو جائے گا''۔

کون کہہ سکتا ہے کہ ان کپڑوں کے مدینہ بھیجنے کا سبب صرف یہ تھا کہ یمن میں اس کے مستحقین موجود نہیں تھے؟ مستحقین رہے ہوں گے' لیکن مدینہ کے مستحقین کا معاملہ مختلف پہلوؤں سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا' اس وجہ سے ان کو مقامی مستحقین پر ترجیح دی گئی۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب یہ مہاجرین کا مسئلہ بالکل حل ہو گیا تو اسی یمن

کی زکوٰۃ کا صرف ایک تہائی حصہ انہی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے مدینہ بھیجا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اعتراض کیا کہ میں نے تمہیں ٹیکس وصول کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا ہے' اس لیے بھیجا ہے کہ وہاں کے مال داروں سے وصول کرو اور وہیں کے غریبوں میں تقسیم کر دو۔ اور جب تک حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ اطمینان نہیں دلا دیا کہ یہاں زکوٰۃ کے مزید حق دار موجود ہی نہیں ہیں اس وقت تک انہوں نے وہاں کی زکوٰۃ مدینہ بھیجنے کی اجازت نہیں دی۔

اسی طرح ایک سے زیادہ مثالیں اس بات کی موجود ہیں کہ مرکز نے کسی مقام کی زکوٰۃ میں اپنا ایک متعین حصہ مقرر کر دیا ہے اور اس بات کی کوئی تصریح نہیں کی ہے کہ مرکز کا حصہ صرف اس حالت میں مرکز کو بھیجا جائے جبکہ کوئی مقامی مستحق موجود نہ ہو۔ مثلاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق ابو عبید نے یہ روایت نقل کی ہے:

قال لابن ابی ذباب وبعثه بعد عام الرمادة فقال اعقل علیهم عقالین فاقسم فیهم احدهما وأتنی بالآخر (کتاب الاموال' ص ٦٠٠)

''عام الرمادہ کے قحط کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے زکوٰۃ کی تحصیل کا کام روک دیا تھا۔ جب قحط دور ہو گیا تو انہوں نے ابو ذباب کو تحصیل زکوٰۃ کے کام پر مقرر کیا اور ان کو یہ حکم دیا کہ لوگوں سے اکٹھے دو سالوں کی زکوٰۃ وصول کرو' آدھی ان میں تقسیم کر دو' آدھی میرے پاس بھیج دو''۔

اسی طرح ایک روایت حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے متعلق بھی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے اموالِ زکوٰۃ میں مرکز کا آدھا حصہ مقرر کیا۔ پھر دوسرے سال جب انہوں نے مرکز کے لیے ضرورت نہیں محسوس کی تو ہر جگہ کی زکوٰۃ مقامی طور پر ہی تقسیم کر دینے کا حکم دے دیا:

عن ابن جریج قال کتب عمر بن عبدالعزیز الی عُمّاله ان ضعوا شطر الصدقة وابعثوا اِلیَّ شطرها قال ثم کتب فی العام المقبل ان ضعوها کلها (کتاب الاموال' ص ٥٩٤)

''ابن جریج راوی ہیں کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اپنے تحصیل داروں کو لکھا کہ زکوٰۃ کی آدھی رقم مقامی ضروریات کے لیے رکھ چھوڑو اور آدھی میرے پاس بھیج دو۔ پھر دوسرے سال انہوں نے یہ حکم جاری کر دیا کہ ساری کی ساری مقامی ضروریات ہی کے لیے رکھ چھوڑ دو۔''

مذکورہ بالا دلائل سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی اور اس کی تقسیم سے متعلق یہ تصور کچھ بہت صحیح نہیں ہے کہ ہر گاؤں اور ہر تھانہ کی زکوٰۃ وہیں وصول کر کے کھڑے کھڑے تقسیم کر دی جائے' بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا' یہ معاملہ تمام تر حکومت کی صوابدید پر منحصر ہے۔ وہ چاہے تو مقامی طور پر تقسیم کرا دے' چاہے تو اس میں مرکز کا کوئی متعین حصہ مقرر کر دے' چاہے تو کسی اہم ضرورت کے پیش نظر کسی علاقہ کی پوری زکوٰۃ کسی دوسرے علاقہ کے غرباء کی امداد کے لیے اس علاقہ میں بھیج دے۔ اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر چاہے تو پورے ملک کی زکوٰۃ مرکزی کنٹرول میں لے کر زکوٰۃ کے مذکورہ مصارف میں سے کسی ایک ہی مصرف پر صرف کرے یا ملک کے غرباء کی اجتماعی بہبود کی کسی خاص اسکیم پر صرف کرے۔

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ آنحضرت ﷺ نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجا ہے تو ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ ((خُذْهَا مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَضَعْهَا فِيْ فُقَرَائِهِمْ)) ''اُن کے مال داروں سے زکوٰۃ وصول کرو اور اُن کے غریبوں میں اُس کو بانٹ دو''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ ہر جگہ کے مقامی مال داروں کی زکوٰۃ کے اصلی مستحق اسی مقام کے غرباء ہیں۔ ہمارے نزدیک اس شبہ کی بنیاد کچھ قوی معلوم نہیں ہوتی' کیونکہ خود حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے بھی نبی ﷺ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں سمجھا کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل نہیں ہوسکتی۔ اگر وہ اس کا یہ مطلب سمجھتے تو یہ بات کس طرح ممکن تھی کہ وہ اس حکم کے بالکل خلاف اہل یمن کے سامنے یہ اعلان کرتے کہ:

> **اِیتونی بکل خمیس ولبیس آخذہ منکم مکان الصدقة فانه ارفق بکم وانفع للمهاجرین والانصار بالمدینة**
>
> ''ہر قسم کے نئے اور پرانے کپڑے میرے پاس لاؤ' میں صدقہ کی جگہ ان کو قبول کروں گا۔ اس میں تمہیں بھی آسانی ہو گی اور مدینہ کے مہاجرین و انصار کا بھی بھلا ہوگا''۔

اب یا تو یہ ہو کہ عام پالیسی تو یہی رہی ہو کہ مقامی اغنیاء سے زکوٰۃ وصول کر کے وہیں مقامی غرباء میں تقسیم کر دی جائے' لیکن خاص مرکز کی ہدایت کے تحت مہاجرین کی ضرورت کے پیش نظر انہوں نے کسی سال اہل یمن سے مذکورہ بالا مطالبہ کیا ہو' یا یہ ہو کہ انہوں نے ((تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَآئِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَآئِهِمْ)) کو اس کے وسیع معنی میں لیا ہو اور ایک انتظامی حکم کی حیثیت سے حالات اور مصالح کے تحت جب جیسا مناسب خیال کیا ہو اُس پر عمل

کیا ہو۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں سے جو شکل بھی فرض کی جائے یہ چیز بالکل صاف واضح ہے کہ یہ لازمی نہیں ہے کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں تقسیم کی جائے۔

پبلک اداروں کی حیثیت

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ کے وصول کرنے اور اس کو تقسیم کرنے کا فریضہ اصلاً ایک اسلامی حکومت ہی سے متعلق ہے۔ وہی جائز طور پر اس بات کی حق دار ہے کہ مال داروں سے اموالِ ظاہرہ کی زکوٰۃ وصول کرے اور اس کے مصارف میں اس کو صرف کرے۔ لیکن اگر کسی جگہ کے مسلمان ایک صحیح اسلامی حکومت یا کم از کم جائز قسم کی اسلامی حکومت کی برکت سے محروم ہوں تو اُن کے لیے صحیح طریقہ کیا ہے؟ کیا یہ کہ اُن میں سے ہر شخص خود مستحقین کو تلاش کر کے اُن میں اپنی زکوٰۃ تقسیم کر دے یا یہ کہ زکوٰۃ وصول کرنے اور تقسیم کرنے کے لیے انہیں اپنے اندر کوئی اجتماعی نظم پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے ذریعہ سے زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا ممکن حد تک کوئی مناسب بندوبست کرنا چاہیے؟ اس سوال کے جواب میں میرا رجحان یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ دوسری ہی صورت صحیح ہے۔ میرے نزدیک اس کی دو وجہیں ہیں:

(۱) اسلام کا مزاج یہ ہے کہ اگر اس کے احکام میں سے کسی حکم کی بجا آوری اس کی اصلی معیاری شکل میں کسی مانع کے سبب سے ممکن نہ ہو تو وہ چاہتا ہے کہ اس حکم کی تعمیل کسی ایسی شکل میں کی جائے جو اصلی شکل سے ملتی جلتی یا کم از کم ذہنوں کے اندر اصلی شکل کی یاد محفوظ کرانے والی ہو تاکہ اصلی حالت کی طرف لوٹنے اور اس کو دوبارہ حاصل کرنے کا شوق دلوں کے اندر قائم رہے۔ چنانچہ جب وضو کرنا کسی مانع کے سبب سے ممکن نہیں ہوتا ہے تو اس کی جگہ پر تیمم کی ہدایت کی گئی ہے۔ اگر نماز اس کی اصلی صورت میں ادا کرنی ممکن نہ ہو تو اس سے قریب تر صورت پر اس کو ادا کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ جنگ کے خطرناک ترین حالات کے اندر بھی اس کے لیے ایسی صورتیں تجویز کی گئی ہیں جس سے اس کی اصلی صورت کا تصور ذہنوں میں باقی رہ سکے۔ یہی صورتِ حال دین کے دوسرے احکام کے اندر بھی ہے۔ اگر ان کو اُس معیاری شکل میں ادا نہیں کیا جا سکتا ہے جو قرآن یا حدیث میں ان کے لیے تجویز کی گئی ہے تو حالات کے لحاظ سے اصل سے ممکن حد تک قریب تر شکل میں ان کو ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس کلیہ کو پیش نظر رکھ کر اگر زیر بحث سوال پر غور کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح معلوم

ہوتی ہے کہ چونکہ زکوٰۃ کی تحصیل وتقسیم کا کام دین میں اجتماعی طور پر مطلوب ہے اور اس کے انجام دینے کی اصلی مجاز اور حق دار درحقیقت ایک اسلامی حکومت ہی ہے' اس وجہ سے اس کی عدم موجودگی میں دین کے مزاج سے اقرب بات یہی ہوگی کہ مسلمانوں کے اندر جس طرح کا نظام شرعی بھی موجود ہو اسی کو اس فرض کی انجام دہی کا ذریعہ بنایا جائے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کی بھی کوئی اجتماعی تنظیم دینی باقی نہ رہ گئی ہو تو مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس قسم کی کوئی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ حد یہ ہے کہ اگر کوئی ایک ہی تنظیم قائم نہ ہو سکے تو اصل سے قریب تر لانے کے لیے یہ شکل بھی گوارا کی جا سکتی ہے کہ ایک سے زیادہ تنظیمیں ہوں جو اپنے اپنے حلقۂ اثر اور اپنے اپنے دائرۂ اعتماد کے اندر اس فرض کو انجام دیں۔ اگرچہ ایک تنظیم کی جگہ کئی تنظیموں کا ہونا ایک انتشار کی صورت ہے لیکن اصل نصب العین سے ذہنوں کو وابستہ رکھنے کے لیے یہ اس کے مقابل میں کہیں بہتر ہے کہ سرے سے کوئی نظم ہی باقی نہ رہ جائے اور ایک کامل انتشار کی حالت طاری ہو جائے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر کسی نوعیت کی بھی کوئی تنظیم باقی نہ رہ جائے یا کسی تنظیم کے بھی' جو موجود ہو' استحقاق کو تسلیم نہ کیا جائے' بلکہ ایک ایک شخص پر اُس کی زکوٰۃ کے ٹھکانے لگانے کی ذمہ داری ڈال دی جائے تو یہ چیز اغنیاء کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مضر ہوگی اور غرباء کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت مہلک ہوگی۔ اوّل تو کسی محرک یا داعی کے نہ ہونے کے سبب سے بہت زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ جو مسلمان آج اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالتے ہیں ان میں سے بھی بہت سے سرے سے زکوٰۃ نکالنا ہی چھوڑ دیں' اور اگر نکالیں بھی تو اُن کی سہل انگاریوں کی وجہ سے اس کا بڑا حصہ ضائع ہی ہو جائے۔ بازار میں ایک تنظیم کے زیر اہتمام فروخت ہونے کی صورت میں قربانی کی جس کھال کی قیمت تین چار روپے مل سکتی ہے' بہت ممکن ہے کہ انفرادی طور پر فروخت کرنے کی صورت میں محلّہ کا قصاب اس کے آٹھ آنے پیسے بھی نہ دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی صریح نقصان کو' جس میں زکوٰۃ دینے والے اور زکوٰۃ پانے والے دونوں شریک ہوں' اسلام کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے زکوٰۃ پانے والوں اور زکوٰۃ دینے والوں دونوں کی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اگر اسلامی حکومت باقی نہیں رہی ہے تو جو بھی مذہبی ادارے مسلمانوں کے اندر موجود ہیں وہی ان کاموں کو حتی الامکان سنبھال لیں جو اجتماعی طور پر کرنے کے ہیں۔ جہاں تک دینے والوں کا تعلق ہے' اگر وہ ان پر اعتماد کرتے ہیں تو یہ ادارے بلا اختلاف اُن کے نمائندے اور وکیل ہیں۔ اور جہاں تک غرباء کا

تعلق ہے' ایک ایسے ملک میں جہاں اسلامی حکومت موجود نہیں ہے' ان کی مثال ایسے یتامیٰ کی ہے جن کا کوئی جائز ولی موجود نہیں ہے۔ اس وجہ سے جو ادارہ بھی ان کے حقوق ان تک پہنچانے اور ان کی خدمت کرنے کی ذمہ داری اٹھالے گا اس کو اس خاص دائرہ کے اندر کامل قسم کی نہ سہی لیکن ایک ناقص قسم کی ولایت تو بہرحال حاصل ہو ہی جائے گی۔

پس یہ بات عقل کے بالکل مطابق اور اسلام کے مزاج کے بالکل موافق معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں وہ پبلک ادارے مسلمانوں کی زکوٰتیں اکٹھی کر کے غرباء کے مصالح پر صرف کریں جن کو پبلک کا اعتماد حاصل ہو۔ کیونکہ یہ صورت اختیار نہ کرنے کی صورت میں جو انتشار رونما ہوگا وہ اغنیاء اور فقراء دونوں کے نقطۂ نظر سے نہایت درجہ نقصان رساں ہے۔ اسی مصلحت کو سامنے رکھ کر مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم نے انگریزی دَور میں مندرجہ ذیل فتویٰ دیا تھا جو میرے نزدیک نہایت گہری دینی مصلحت پر مبنی ہے۔ میں یہ فتویٰ ناظرین کی آگاہی کے لیے یہاں درج کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

''زکوٰۃ وعشر وغیرہ فرائض مالیہ کا وجوب جن حکمِ شرعیہ اور مصالح بشریہ پر مبنی ہے ان کا تقاضا یہ ہے کہ ادائے زکوٰۃ وعشر اور مستحقین پر ان کی تقسیم میں تنظیم کا کامل لحاظ رکھا جائے اور ظاہر ہے کہ انفرادی تصرفات میں تنظیم مفقود ہوتی ہے۔

اس غلامی کے دَور میں جو تفرق وتشتت کا دَور ہے' امکانی صورت یہی نظر آتی ہے کہ اہل حل وعقد کی کوئی جماعت اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے''۔ (کتاب العشر والزکوٰۃ' عبدالصمد رحمانی' ص ۱۰۷) (محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ)

مصارفِ زکوٰۃ

اگر مذکورہ تینوں باتیں صحیح مان لی جائیں' یعنی:

ایک یہ کہ ادائیگی زکوٰۃ کے لیے تملیک کوئی ضروری شرط نہیں ہے۔ اس کے حق میں کوئی نص موجود نہیں ہے۔ جو لوگ تملیک کے رکن یا شرط ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جو کچھ پیش کرتے ہیں اس کی حیثیت ایک استنباط سے زیادہ نہیں ہے۔ اور محض ایک استنباط اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی بنا پر تملیک کو زکوٰۃ کا رکن قرار دے دیا جائے۔

دوسری یہ کہ ایک جگہ کی زکوٰۃ دوسری جگہ منتقل ہوسکتی ہے۔ ایک اسلامی حکومت اس بات کی پوری طرح مجاز ہے کہ وہ چاہے تو ہر جگہ کی زکوٰۃ وہیں کے مقامی غرباء پر صرف کر دے' چاہے تو کسی خاص علاقہ کی زیادہ شدید ضرورت کی بنا پر وہاں منتقل کر دے' چاہے تو ہر

علاقہ کی زکوٰۃ میں سے مرکز کا ایک حصہ متعین کر دے اور اس کو خاص اپنے اہتمام میں صَرف کرے' اور اگر چاہے تو پورے ملک کی زکوٰۃ اپنے اہتمام میں لے کر غرباء کی بہبود کی کسی خاص اسکیم پر خرچ کرے۔

تیسری یہ کہ ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی حالت میں مسلمانوں کے لیے صحیح صورت زکوٰۃ کے جمع کرنے اور خرچ کرنے کی یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اس کے لیے کوئی اجتماعی نظم قائم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس طرح کا کوئی ایک ہی اجتماعی نظم قائم نہ ہو سکے تو پھر ادنیٰ درجہ میں ان کے لیے اسلام کے مزاج سے اور اس پالیسی سے جو اُس نے زکوٰۃ کے جمع و تقسیم کے بارہ میں پسند کی ہے (قریب تر) یہ بات ہے کہ ان کے مختلف طبقات یا ان کی مختلف جماعتیں جن اسلامی ادارات پر اعتماد کرتی ہیں انہی کو وہ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا ذریعہ بنائیں' تاکہ ممکن حد تک زکوٰۃ کی افادیت اور غرباء کی بہبود کو ملحوظ رکھا جا سکے۔ غربائے مسلمین کی حقیقی ولی ——— اسلامی حکومت ——— کی عدم موجودگی میں انہی ادارات کو اُن کی ولایت حاصل ہے۔ اور انہی کو یہ حق حاصل ہے کہ جب تک کوئی بہتر نظم وجود میں نہ آ جائے یہ غرباء کے لیے زکوٰتیں جمع کریں اور اسے غرباء کے مصالح میں صَرف کریں۔

اگر یہ تینوں باتیں اہل علم اور اہل دین کو اپیل کرتی ہیں اور ان کے حق میں جو دلیلیں اوپر بیان ہوئی ہیں وہ کچھ جان دار اور وزنی معلوم ہوتی ہیں تو پھر زکوٰۃ کے مصارف پر ایک وسیع زاویۂ نگاہ سے غور کرنا پڑے گا' اور میں چاہتا ہوں کہ اپنا نقطۂ نظر یہاں اہل علم کے سامنے رکھ دوں تاکہ وہ اس پر غور کر سکیں۔ قرآن مجید میں' جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے' زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین سورۃ التوبۃ کی اس آیت سے ہوتی ہے:

﴿اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ﴾ (آیت ۶۰)

مَیں اسی آیت کے مختلف اجزاء کی وضاحت کروں گا۔

فقراء اور مساکین

زکوٰۃ کا سب سے پہلا مصرف فقراء اور مساکین کو بتایا گیا ہے۔ یہ ذکر میں تقدیم اس بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کا حق مقدم ہے۔ یہ دونوں لفظ جب الگ الگ استعمال ہوتے ہیں تو بسا اوقات ایک دوسرے کے ہم معنی کی حیثیت سے استعمال ہوتے ہیں' لیکن جب ایک ساتھ آتے ہیں تو استعمالات سے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک لطیف قسم کا فرق

ہوتا ہے۔ فقیر سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو کمانے' ہاتھ پاؤں مارنے' زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کا دم داعیہ تو رکھتے ہیں' لیکن مالی احتیاج ان کے راستہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اور مسکین سے وہ طبقہ مراد ہوتا ہے جو مسلسل غربت اور احتیاج کا شکار رہنے کے سبب سے جدوجہد کرنے اور مشکلات پر قابو پانے کا حوصلہ ہی کھو بیٹھتا ہے اور اس کے اوپر دل شکستگی اور مسکنت طاری ہو جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا اوّلین مصرف یہ ہے کہ سوسائٹی کے ان دونوں طبقات کو اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

اس اٹھانے میں جس طرح یہ بات شامل ہو گی کہ ان کی جسمانی ضروریات کھانا' کپڑے اور مسکن فراہم کی جائیں' اسی طرح ان کی عقلی اور اخلاقی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری ہو گا کہ ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ جس طرح یہ لازمی ہے کہ ان کی وقتی احتیاج رفع کی جائے' اسی طرح یہ بھی غالباً ضروری ہے کہ ان کو مفلسی اور بدحالی کی دلدل سے نکالنے کی مستقل تدبیریں اختیار کی جائیں' تاکہ وہ اپنی ذاتی جدوجہد اور اپنی ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر سوسائٹی کے اندر باعزت زندگی بسر کر سکیں اور مستقلاً دوسروں پر بار بنے رہنے کے بجائے دوسروں کے بوجھ اٹھانے کے قابل ہو سکیں۔ ان مقاصد کے پیش نظر زکوٰۃ کی مد سے ان کے لیے روٹی' کپڑا اور مکان بھی مہیا کیا جا سکتا ہے' ان کے لیے تعلیمی اور تربیتی ادارے بھی کھولے جا سکتے ہیں' ان کے لیے دارالمطالعے اور کتب خانے بھی قائم ہو سکتے ہیں' ایسے صنعتی ادارے بھی ان کے لیے جاری کیے جا سکتے ہیں جن میں ان کے بچے مختلف قسم کی صنعتیں سیکھ کر مستقبل میں اپنے اوپر اعتماد کے قابل بن سکیں۔ اسی طرح ان کے علاج کے لیے ایسے شفاخانے بھی کھولے جا سکتے ہیں جہاں بوقتِ ضرورت ان کو مفت دوا حاصل ہو سکے' جہاں ان کی عورتوں کو ولادت کے موقع پر مفت طبی امداد حاصل ہو سکے۔ علیٰ ہذا القیاس ان کے مُردوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام بھی کیا جا سکتا ہے اور ان کے زندوں اور مُردوں کے قرضے بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اور اس طرح کے سارے کام غرباء کے لیے زکوٰۃ کی مد سے کیے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض صورتوں میں تملیک ہو گی بعض صورتوں میں نہیں ہو گی' لیکن زکوٰۃ کا نفع ہر صورت میں اصلاً غرباء ہی کو پہنچے گا' یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اجتماعی تملیک بہرحال غرباء ہی کی ہو گی۔

عاملینِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کا دوسرا مصرف زکوٰۃ کے عاملین ہیں۔ اگرچہ یہ زکوٰۃ کے مستحق تبعاً اور ضمناً ہیں'

اصلاً نہیں ہیں' لیکن زکوٰۃ کی تحصیل و وصول میں چونکہ ان کو ایک ناگزیر عامل کی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے ان کا ذکر دوسرے ہی نمبر پر آ گیا ہے۔ عاملین سے مراد زکوٰۃ کے وصول کرنے والے کارکن ہیں۔ اس لفظ کے اندر تحصیل دار سے لے کر اس کے پٹواری اور سپاہی تک سب شامل ہیں۔

قال ابن عباس ـــــ ویدخل فی العامل ـــــ الساعی والکاتب والقاسم والحاشر الذی یجمع الاموال وحافظ المال والعریف

(نیل الاوطار' ج ٤' ص ١٨٠)

''عامل کے لفظ کے اندر تحصیل دار' منشی' تقسیم کرنے والا' مال اکٹھا کرنے والا' خزانچی اور کھیا سب شامل ہیں''۔

احادیث اور تاریخ کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کمیشن اور اُجرت پر بھی لیا جاتا رہا ہے' اور اس غرض کے لیے وصولیٔ زکوٰۃ کے موسم میں خاص طور پر کارکن بھی بھرتی کیے جاتے رہے ہیں' لیکن یہ موقع ان تفصیلات میں جانے کا نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ سامنے لانا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ایک اسلامی حکومت میں زکوٰۃ کی تحصیل اور اس کے اہتمام و انتظام پر جو عملہ مقرر ہوگا اس کے چھوٹے اور بڑے سارے کارکنوں کی تنخواہیں اس سے دی جا سکتی ہیں۔ اس کے آمد و خرچ کے ریکارڈ رکھنے کے لیے جو دفاتر قائم ہوں گے اُن پر بھی اسی مدّ سے لازماً خرچ ہوگا۔ اور جب **عاملین علیها** کے معاوضے اور ان کے دفاتر کے خرچ اس مدّ سے پورے کیے جا سکتے ہیں تو ''**عمل علیها**'' یعنی حمل و نقل' فراہمی اور حفاظت وغیرہ پر' نیز اس سلسلہ کے پروپیگنڈے پر جو کچھ خرچ ہوگا آخر وہ کیوں نہیں اس مدّ سے پورا کیا جا سکتا؟

ایک اسلامی حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں اگر اسلامی اداروں کو زکوٰۃ کی وصولی اور اس کے صَرف کا حق حاصل ہے' اور اس عاجز کے نزدیک ان کو یہ حق حاصل ہے' جیسا کہ دلائل کے ساتھ اوپر عرض کیا گیا' تو لازماً یہ حق بھی ان کے لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ زکوٰۃ کے مال اکٹھے کرنے' ان کے حساب کتاب رکھنے' ان کے لانے اور لے جانے' ان کے محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے' ان کے مصارف میں ان کے صَرف کرنے پر' نیز اس مقصد کے لیے دعوت و تبلیغ پر جو کچھ وہ خرچ کریں گے وہ سب اس مدّ سے دیا جا سکتا ہے۔

مؤلّفۃ القلوب

ابن کثیر نے مؤلفۃ القلوب کی مندرجہ ذیل قسمیں گنائی ہیں:

۱) ایسے غیر مسلم لیڈر اور سردار جن کو اسلام کی طرف مائل کرنا مقصود ہو

۲) ایسے بااثر نومسلم جن کے اسلام سے پھر جانے کا اندیشہ ہو اور جن کا ارتداد اسلام اور مسلمانوں کے لیے مضر ہو سکتا ہو۔

۳) ایسے بااثر لیڈر جن کی تالیفِ قلب ان کے ہم چشموں کو اسلام کی طرف مائل کرنے میں مددگار ہو سکتی ہو۔

۴) ایسے سردار جو اپنے علاقہ میں اسلامی حکومت کو مالیہ کی وصولی میں مدد دیں اور سرحدی علاقوں کو دشمن کے خطرات سے محفوظ رکھنے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ (دیکھو تفسیر ابن کثیر' ج ۲' ص ۳۶۵۔ تفسیر آیۃ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ..... الآیۃ۔)

ایسے نومسلم یا غیر مسلم سردار جن کو اسلام کے حق میں ہموار کرنے یا جن کو اسلام پر ثابت قدم رکھنے کے لیے صدرِ اوّل میں اسلامی بیت المال سے بھاری بھاری رقمیں دی گئی ہیں' ابنِ جوزی کے بیان کے مطابق تقریباً پچاس ہیں' جن میں سے چند ایک کے نام امام شوکانی نے نیل الاوطار میں بھی گنائے ہیں جن کو خود نبی ﷺ نے سو سو اونٹ دلوائے۔ ہم یہ نام یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ کس کس طرح کے سردارانِ قبائل اور بااثر اشخاص مؤلفۃ القلوب کے زمرہ میں شامل رہے ہیں اور زکوٰۃ کی مدّ سے عطیے پانے کے مستحق قرار دیے گئے ہیں۔

صاحب نیل الاوطار نے جن ناموں کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہیں:

ابوسفیان بن حرب' صفوان بن امیہ' عیینہ بن حصن' اقرع بن حابس' عباس بن مرداس' علقمہ بن علاثہ۔

ابن کثیر نے زید الخیر کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا ہے۔ جو لوگ اس دَور کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو اسلام کی تاثیر سے نہیں بلکہ اسلام کی قوت سے مرعوب ہو کر اس کے مطیع ہوئے تھے' بلکہ ان میں سے صفوان بن اُمیہ کو تو کفر پر باقی رہتے ہوئے حضور ﷺ نے بڑے بڑے عطیے دیے' یہاں تک کہ خود اُن کا اپنا بیان یہ ہے کہ حنین کے موقع پر حضور ﷺ نے مجھے دیا اور اُس وقت میرے نزدیک آپؐ سے زیادہ کوئی دوسرا مبغوض نہ تھا' لیکن آپؐ برابر دیتے رہے' یہاں تک کہ پھر آپؐ سے زیادہ میرے نزدیک کوئی دوسرا محبوب نہیں رہا۔

مذکورہ ناموں اور مذکورہ مقاصد پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص خود اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ

خرچ ایک بالکل پولیٹیکل خرچ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو جو سیاسی اہمیت اور پولیٹیکل اثر واقتدار رکھتے ہیں' اسلام اور اسلامی حکومت کے حق میں ہموار کیا جائے اور اگر وہ اسلام کے اندر (کسی نوعیت سے سہی) داخل ہو چکے ہیں تو اُن کو اسلام پر مضبوط کیا جائے۔

احناف کے نزدیک اسلام کے غلبہ واقتدار کے نمایاں ہو جانے کے بعد یہ مدّ ساقط ہو گئی' لیکن یہ بات کئی پہلوؤں سے کمزور معلوم ہوتی ہے۔

اوّل تو جس واقعہ سے وہ اس کے سقوط پر استدلال کرتے ہیں اس سے زیادہ سے زیادہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ایک خاص علاقہ کے سرداروں کو غلبۂ اسلام کے بعد اُن رعایتوں سے محروم کر دیا جو انہیں بطور تالیفِ قلوب کے حاصل تھیں۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی علاقہ میں اسلامی حکومت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ اسے اس طرح کے کسی پولیٹیکل خرچ کے سہارا لینے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے تو وہ اس کو خواہ مخواہ کیوں جاری رکھے گی؟ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اب کہیں بھی اس کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے' یا کبھی بھی اس کی ضرورت نہیں پیش آ سکتی ہے۔

دوم یہ کہ اگر یہ مدّ اس لیے ساقط قرار دی گئی تھی کہ اُس وقت اسلام کو پورا غلبہ حاصل ہو گیا تھا تو اب اس زوال اور مسلمان حکومتوں کے اس ضعف کے دَور میں اس کو از سرِ نو بحال ہو جانا چاہیے' کیونکہ اس دور میں تو شاید ہی کوئی مسلمان حکومت ایسی ہو جو اپنے حق میں دوسروں کو رام کرنے اور خود اپنوں کو اپنے حق میں ہموار رکھنے کی ضرورت سے بالکل مستغنی ہو۔

سوم یہ کہ کوئی حکومت خواہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے' لیکن وہ اس قسم کے پولیٹیکل خرچ سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتی۔ امریکہ اور روس جیسی حکومتیں بھی آج اس بات کی محتاج ہیں کہ دوسروں کو اپنے اور اپنے نصب العین کے حق میں ہموار رکھنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کریں۔ پھر آج اگر ایک صحیح قسم کی اسلامی حکومت قائم ہو تو کس طرح اس چیز سے مستغنی رہ سکے گی؟ البتہ اگر فرق ہو گا تو یہ فرق ہو گا کہ اسلامی حکومت یہ سب کچھ دین حق اور کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے کرے گی' اور یہ حکومتیں یہ سب کچھ کلمۂ کفر کی سربلندی کے لیے کرتی ہیں۔

چنانچہ دوسرے علماء اور ائمہ یہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

ابوعبید کتاب الاموال میں حنفیہ کے نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:

واما ما قال الحسن وابن شهاب فعلى ان الامر ماض ابدًا وهذا هو

القول عندی لان الایة محکمة لا نعلم لها ناسخا من کتاب ولا سنة فاذا کان قوم هذه حالهم ' لا رغبة لهم فی الاسلام الا للنیل وکان فی ردّتهم ومحاربتهم ضرر علی الاسلام لما عندهم من الغزو المنعة' فرای الامام ان یرضخ لهم من الصدقة فعل ذالك لخلال ثلاث : احداهن الاخذ بالکتاب والسنة والثانیة البقیا علی المسلمین ' والثالثة انه لیس بیایس منهم ان تماری بهم الاسلام ان یفقهوه وتحسن فیهم رغبتهم (کتاب الاموال' ص ٦٠٧)

''اور یہ جو حسن اور ابن شہاب نے کہا ہے تو انہوں نے یہ پیش نظر رکھ کر کہا ہے کہ یہ حکم ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور یہی قول ہمارا بھی ہے' کیونکہ یہ آیت محکم ہے' قرآن یا سنت سے اس کے منسوخ ہونے کا کوئی ثبوت ہمارے علم میں نہیں ہے۔ جب ایسے لوگ موجود ہوں جن کا اسلام کی طرف میلان صرف مال کے لیے ہو اور اُن کے ارتداد یا ان سے جنگ کی صورت میں بھی ان کی طاقت وقوت کے سبب سے اسلام کے لیے خطرہ ہو تو ایسی صورت میں اگر اسلامی حکومت صدقہ کی مد سے ان کی دلجوئی کرے تو تین وجوہ سے وہ ایسا کر سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسا کر کے کتاب وسنت کے ایک حکم کی تعمیل کرے گی' دوسری یہ کہ اس میں مسلمانوں کی ہمدردی ہے' تیسری یہ کہ وہ یہ توقع کر سکتی ہے کہ اگر ان لوگوں کو کچھ عرصہ اسی طرح اسلام پر قائم رکھا جا سکا تو کیا عجب وہ اسلام کو سمجھنے لگیں اور دل سے اس کو قبول کر لیں۔''

یہی نقطۂ نظر صاحب نیل الاوطار کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

والظاهر جواز التالیف عند الحاجة الیه ۔ فاذا کان فی زمن الامام قوم لا یطیعونه الا للدنیا ولا یقدر علی ادخالهم تحت طاعته بالقسر والغلب فله ان یتالفهم ولا یکون لفشوّ الاسلام تاثیر لانه لم ینفع فی خصوص هذه الواقعة (نیل الاوطار' ج ٤' ص ١٧٧)

''اور ظاہر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر ضرورت داعی ہو تو مال کے ذریعہ سے پرچانا جائز ہے۔ اگر حکومت اسلامی کو ایسے لوگوں سے سابقہ ہو جو مال کے بغیر اطاعت کرنے پر راضی نہ ہوں اور جبر وزور کے ذریعہ سے ان کو زیر اطاعت لانے کی قدرت نہ ہو تو اس کے لیے یہ جائز ہے کہ مال کے ذریعہ سے ان کی تالیف قلب

کرے۔ اور اسلام کے غلبہ کا اس امر پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا' کیونکہ مذکورہ صورت میں تو صاف واضح ہے کہ وہ کچھ مؤثر نہیں ہے۔''

یہی رائے علامہ ابن حزم نے محلّٰی میں ظاہر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وادعی قوم ان سهم المؤلفة قلوبهم قد سقط۔ قال ابو محمد وهذا باطل' بل هم اليوم اكثر ما كانوا وانما يسقطون هم والعاملون اذا تولى المرء قسمة صدقة نفسه لانه ليس هنالك عاملون عليها' وامر المؤلفة الى الامام لا الى غيره (المُحلّٰی' ج٦' ص ١٤٥)

''اور ایک گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد ساقط ہو چکی ہے اور ابو محمد (ابن حزم) کا کہنا یہ ہے کہ آج وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ موجود ہیں۔ مؤلفۃ القلوب اور عاملین کی مدیں تو اُس وقت ساقط ہوں گی جب ہر شخص اپنے صدقہ وزکوٰۃ کی تقسیم کی ذمہ داری خود سنبھال لے' کیونکہ اس صورت میں عاملین سرے سے ہوں گے ہی نہیں اور مؤلفۃ القلوب کا معاملہ تمام تر اسلامی حکومت سے متعلق ہے' افراد سے اس کا تعلق ہی نہیں ہے۔''

ان اقوال سے صاف ظاہر ہے کہ مؤلفۃ القلوب کی مد جس طرح پہلے ضروری تھی اسی طرح اب بھی ضروری ہے اور اس مد پر زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جس طرح ایک اسلامی حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ صدقات اور زکوٰۃ کی آمدنی سے اس خالص پولیٹیکل مقصد پر خرچ کرے' اسی طرح اسلامی حکومت کی عدم موجودگی میں دینی اداروں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے اس کو صرف کریں؟ اس بارہ میں میرا رجحان یہ ہے کہ یہ ایک خالص پولیٹیکل خرچ ہے جس کی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونا ایک حکومت ہی کے لیے ممکن ہے۔ اس وجہ سے پبلک اداروں اور انجمنوں کو اپنے تصرفات اسی حد تک محدود رکھنے چاہئیں جس حد تک محدود رکھنے کا انہوں نے اظہار و اعلان کیا ہے' اور جس دائرہ کے اندر خرچ کرنے کے لیے زکوٰۃ ادا کرنے والوں نے ان پر اعتماد کیا ہے۔ صرف بعض صورتیں اس سے مستثنیٰ کی جا سکتی ہیں' مثلاً اگر کسی جگہ کے مسلمان بالکل کفر اور اہل کفر کے زیر اثر آ گئے ہوں اور وہ محسوس کرتے ہوں کہ مال خرچ کر کے بعض مسلمانوں کو کفر کے لیے استعمال ہونے سے بچایا جا سکتا ہے' یا اس کے ذریعہ سے مخالفین کو اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی سے روکا جا سکتا ہے' تو اس مقصد کے لیے

زکوٰۃ کے مال میں سے بھی وہ خرچ کر سکتے ہیں۔

فی الرقاب

فی الرقاب سے مطلب یہ ہے کہ غلاموں کے آزاد کرنے پر بھی زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اب غلامی کا مسئلہ ختم ہو چکا ہے' لیکن قرآن کے نزول کے وقت یہ مسئلہ موجود تھا۔ اس وجہ سے ایک اہم انسانی خدمت کے پہلو سے ان کی اعانت اور اُن کی آزادی کو بھی زکوٰۃ کے مصارف میں سے ایک مصرف قرار دیا گیا۔

اس امر میں اختلاف ہوا ہے کہ اس سے مراد ہر طرح کے غلام ہیں یا صرف وہ غلام مراد ہیں جو اپنے آقاؤں سے ایک متعینہ رقم کی ادائیگی کی شرط پر اپنی آزادی کا اقرار حاصل کر لیتے ہیں' جن کو اصطلاح میں مکاتب کہتے ہیں۔ احناف اور شوافع کے نزدیک اس سے صرف مکاتب مراد ہیں۔ لیکن ابن عباس' حسن بصری' امام مالک' امام احمد بن حنبل' ابوثور' ابوعبید اور امام بخاری وغیرہ کے نزدیک یہ دونوں قسم کے غلاموں کے لیے عام ہے۔ ان کے نزدیک صدقات کی رقم سے ایک غلام کو خرید کر آزاد کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے' بلکہ مکاتب کی اعانت کے مقابل میں اولیٰ و افضل ہے۔ (نیل الاوطار' ج ۴' ص ۱۷۸) لیکن احناف اور شوافع کے نزدیک صدقات کی مد سے مکاتب کی اعانت تو کی جا سکتی ہے' لیکن کسی غلام کو مستقلاً خرید کر آزاد نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے اس معاملہ میں امام مالک اور امام احمد بن حنبل کا مذہب زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اوّل تو اس سبب سے کہ اس بحث میں سارا مدارِ سخن ''حرفِ لام'' پر ہے' تھوڑی دیر کے لیے مان لیجیے کہ وہ تملیک ہی کے مفہوم کے لیے خاص ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ ''الرقاب'' پر وہ کہاں داخل ہے؟ یہاں سے تو اب ''فِیْ'' کا دخل شروع ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جتنے مصارف بیان ہوئے ہیں سب ''فِیْ'' ہی کے تحت ہیں۔ ''فِیْ'' کے متعلق یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اس کے اندر بھی تملیک کے مفہوم کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر تو جیسا کہ اوپر گزرا' مصلحت' مفاد اور بہبود کا مفہوم پایا جاتا ہے' جس کے معنی یہ ہوئے کہ زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور اُن کو آزاد کرنے کے لیے صَرف کی جا سکتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ تملیک پائی جائے یا نہیں۔ ثانیاً یہ کہ ہم مانے لیتے ہیں کہ تملیک کا مفہوم ''فِیْ'' کے اندر بھی گھسا ہوا ہے' لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ہم ایک غلام کو اُس کے مالک سے خرید کر آزاد کر دیتے ہیں تو اس میں تملیک کیوں نہیں پائی جاتی؟ اگر ایک مسکین کو زکوٰۃ کے پیسوں سے روٹی خرید کر

دے دیں تو اس صورت میں تملیک پائی جائے گی یا نہیں؟ اسی طرح اگر ایک شخص کو ہم اس کی آزادی خرید کے اس کے حوالہ کر دیتے ہیں تو آخر تملیک کیوں نہیں پائی گئی؟ یہ ہم نے اس مفروضہ پر عرض کیا ہے کہ تملیک کا مفہوم ''فِیْ'' کے اندر بھی لے لیا جائے۔ لیکن ہمارے نزدیک' جیسا کہ عرض کیا گیا' یہ صحیح نہیں ہے۔ ''فِیْ'' اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ صدقات و زکوٰۃ غلاموں کی بہبود اور ان کی آزادی کی مہم میں صرف کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی مکاتب اپنی مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے لیے اعانت کا طالب ہے تو آپ اس کو بھی دے سکتے ہیں اور اگر آپ خود کسی غلام کو خرید کر اس کو آزاد کرنا چاہیں تو یہ بھی بے تکلف کر سکتے ہیں۔ بلکہ اگر خدانخواستہ کسی جنگ کے نتیجہ کے طور پر دنیا میں پھر غلامی کا مسئلہ پیدا ہو جائے اور خدمت انسانیت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر ایسی انجمنیں قائم ہوں جو اُن غلاموں کی آزادی اور ان کی سود و بہبود کے لیے وسیع پیمانہ پر تحریک چلائیں تو اس تحریک پر بھی صدقات و زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے۔

ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ چونکہ مستقلاً کسی غلام کو آزاد کرنے کی صورت میں اس کا حق ولا اس کے آزاد کرنے والے کو حاصل ہوگا اور یہ خود اپنی زکوٰۃ سے ایک قسم کے انتفاع کی شکل ہوئی' اس وجہ سے اس کو ناجائز ہونا چاہیے۔ لیکن میرے نزدیک یہ شبہ کچھ وزنی نہیں ہے۔ اوّل تو یہ اعتراض اس صورت میں سرے سے وارد ہی نہیں ہوتا جبکہ کوئی اسلامی حکومت یا پبلک ادارہ زکوٰۃ کے فنڈ سے کسی غلام کو خرید کر آزاد کرے' کیونکہ اس صورت میں اس آزاد کردہ غلام کا ولا عام مسلمانوں کو حاصل ہوگا جو شخصی انتفاع کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ ثانیاً زکوٰۃ یا اس طرح کی کسی چیز سے وہ شخصی انتفاع ناجائز ہے جس کو پیش نظر رکھ کر ہی زکوٰۃ دی جائے یا وہ کام کیا جائے۔ اگر یہ صورت نہ ہو' بلکہ زکوٰۃ تو دی جائے اس کے اصل مقصد کو سامنے رکھ کر' لیکن اس کے نتیجہ میں زکوٰۃ دینے والے کو کوئی فائدہ حاصل ہو جائے تو اس کے سبب سے اس کا یہ کام ناجائز نہیں ہوگا۔ اگر ایک شخص حج اس لیے کرتا ہے کہ وہ عرب کی سیاحت کرنا چاہتا ہے تو اس کا حج بلاشبہ نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ حج' حج کے ارادہ سے کرتا ہے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اسے حجاز کی سیاحت کا بھی موقع مل جاتا ہے تو آخر اس سے اس کا حج کیوں باطل ہو جائے گا؟

غارمین

زکوٰۃ و صدقات کا مال ''غارمین'' کی امداد میں بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ غارمین سے

مراد وہ لوگ ہیں جو کسی کاروباری اتار چڑھاؤ یا حالات کی نامساعدت کے سبب سے قرضے کے نیچے دب گئے ہوں' یا کسی آفتِ ارضی و سماوی نے ان کے گلہ' یا باغ' یا کھیتی' یا سرمایہ یا کاروبار کو تباہ کر دیا ہو' یا انہوں نے اصلاحِ ذات البین کے ارادہ سے دوسروں کی کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہو۔

اس طرح کے لوگوں کی امداد اس نقطۂ نظر سے کی جائے گی کہ یہ معاشرہ کے کماؤ اور قابل افراد ہیں' ان کو گرنے اور تباہ ہونے سے بچایا جائے' تاکہ یہ جس چکر میں آ گئے ہیں اس سے نکل کر پھر اپنی صلاحیتوں سے قوم اور معاشرہ کو بہرہ مند کر سکیں۔ ان کی امداد اُن کے فقر یا ان کی مسکنت کی بنا پر نہیں کی جائے گی۔ اگر اس بنا پر کی جانی ہوتی تو ان کا ذکر ایک مستقل عنوان سے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی' پھر تو یہ فقراء اور مساکین کے زمرہ میں آپ سے آپ آ جاتے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کی احتیاج کے ناپنے کا پیمانہ اس سے بالکل مختلف ہوگا جو فقراء اور مساکین کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے دلائل ملاحظہ ہوں:

> کتب عمر بن عبد العزیز ان اقضوا عن الغارمین فکتب الیه انا نجد الرجل له المسکن والخادم والفرس والاثاث' فکتب عمر انه لابدّ للمرء المسلم من مسکن یسکنه' وخادم یکفیه مهنته' وفرس یجاهد علیه عدوه ومن ان یکون له الاثاث فی بیته نعم فاقضوا عنه (کتاب الاموال' ص ۵۵۶)
>
> ''حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے عمال کو یہ فرمان لکھا کہ زیرباروں کے قرضے ادا کیے جائیں۔ ان کے عمال کی جانب سے ان کو یہ اطلاع دی گئی کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاس مکان موجود ہے' نوکر موجود ہے' گھوڑا موجود ہے' گھر میں فرنیچر اور اثاثہ موجود ہے' کیا ایسے لوگوں کے قرضے بھی اتارے جائیں؟ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ ایک مسلمان کے لیے ایک مکان جس میں وہ رہ سکے' ایک نوکر جو اُس کا ہاتھ بٹا سکے' ایک گھوڑا جس پر وہ اپنے دشمن سے مقابلہ کر سکے اور گھر میں کچھ سروسامان تو ناگزیر چیزیں ہیں۔ اس وجہ سے میں کہتا ہوں کہ ہاں' ان لوگوں کے قرضے بھی ادا کرو۔''

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عمال کو یہ شبہ ہوا تھا کہ غارمین جب تک فقر کی اس حد کو نہ پہنچ جائیں جو فقراء اور مساکین کے لیے مقرر ہے' اُس وقت تک صدقات کی مد سے ان کے قرضے یا ان کی ذمہ داریاں نہیں ادا کی جا سکتی ہیں۔ لیکن حضرت عمر بن

عبدالعزیز نے اپنے جواب سے یہ بات صاف کر دی کہ اس طبقہ کا صرف فقر دُور کرنا مقصود نہیں ہے' بلکہ اس کو اٹھانا مقصود ہے۔ اس وجہ سے اس کی احتیاج کو اس پیمانہ سے نہ ناپو جس پیمانہ سے فقراء و مساکین کی احتیاج کو ناپتے ہو۔ اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہدِ معدلت گستر میں اپنے عمال کو یہ حکم دیا تھا کہ:

اعطوا من الصدقة من ابقت له السنة غنما ولا تعطوها من ابقت له السنة غنمين (کتاب الاموال' ص ۵۵۸)

''صدقہ کے مال سے ان کی مدد کرو جن کا قحط سے صرف ایک ریوڑ بچ رہا ہو اور ان کی مدد نہ کرو جن کے پاس دو ریوڑ بچ رہے ہوں''۔

روایت میں لفظ ''غنم'' کا ہے۔ غنم سے مراد بکریوں کا ایک ریوڑ ہوتا ہے جو کم و بیش سو بکریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سو بکریاں اس حدِ احتیاج سے بہت زیادہ ہیں جن میں آدمی زکوٰۃ کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اتنی بکریوں کی موجودگی میں تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے۔ لیکن اگر قحط یا کسی دوسری آفت کے سبب سے کسی کا گلہ تباہ ہو جائے اور اس کے پاس صرف سو بکریاں بچ رہیں تو وہ بحیثیت ایک غارم کے مستحق ہے کہ حکومتِ اسلامی صدقات کے فنڈ سے اس کو سہارا دے' تاکہ وہ اپنے کاروبار کو سنبھالے رکھ سکے۔

جو شخص محض اس بنا پر غارم کے حکم میں آ جاتا ہے کہ اس نے مسلمانوں کے آپس کے کسی جھگڑے کو چکانے کی خاطر کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے تو اُس کی غربت و امارت کا تو کوئی سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ تو ایک امیر کبیر ہوتے ہوئے بھی ایک غارم ہے اور مستحق ہے کہ اپنی اُٹھائی ہوئی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صدقات و زکوٰۃ سے امداد پائے۔ امام شوکانی لکھتے ہیں:

''اہل عرب کا حال یہ تھا کہ جب ان کے درمیان کوئی ایسا جھگڑا برپا ہوتا جو دیت وغیرہ کے قسم کے کسی مالی مطالبہ پر مبنی ہوتا تو کوئی شخص اٹھتا اور جھگڑے کو چکانے کے لیے محض للہ فی اللہ اس ذمہ داری کو اپنے سر لے لیتا اور جھگڑا ختم ہو جاتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ چیز مکارمِ اخلاق میں شامل ہے۔ جب لوگوں کو پتا چلتا کہ کسی شخص نے اس طرح کی کوئی ذمہ داری اٹھائی ہے تو اس کی امداد کے لیے سبقت کرتے' یہاں تک کہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا۔ اور اگر اس مقصد کی خاطر اُس کو لوگوں سے سوال کرنے کی نوبت آتی تو یہ چیز اس کی عزت میں کوئی کمی نہ کرتی' بلکہ اس کے

لیے وجہ فخر ہوتی۔'' (نیل الاوطار ج ۴ ص ۱۷۹)

بس ایک چیز اس میں دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ ایک شخص فی الواقع کسی ارضی وسماوی آفت یا کسی واقعی اُتار چڑھاؤ کی زد میں آ کر زیر بار ہوا ہے یا محض اپنی مشیخت اور اپنے اسراف یا اپنے شوقِ قسمت آزمائی کا شکار ہوا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو وہ غارم ہے اور زکوٰۃ کے فنڈ سے مدد پانے کا مستحق۔ لیکن اگر دوسری صورت ہو تو اس کی حوصلہ افزائی کم از کم زکوٰۃ و صدقات کی مد سے نہیں کرنی چاہیے ورنہ یہ چیز بہتوں کو غلط راہ پر ڈال دے گی۔

فی سبیل اللہ

فی سبیل اللہ ایک وسیع مفہوم رکھنے والی اصطلاح ہے جس کے اندر نیکی اور بھلائی کے وہ سارے کام داخل ہیں جن کی طرف اللہ اور اس کے رسولؐ نے رہنمائی فرمائی ہے۔ اس کی مقابل اصطلاح فی سبیل الطاغوت ہے جس سے مراد وہ پورا نظامِ ضلالت ہے جو شیطان نے بچھا رکھا ہے۔ اس تقابل کی روشنی میں غور کیجیے تو یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ سبیل اللہ سے مراد وہ پورا نظامِ ہدایت بحیثیتِ مجموعی بھی ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اور اس کے الگ الگ اجزاء بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ اگر بحیثیتِ مجموعی اس پورے نظام کے قیام و بقاء اور اس کی حفاظت اور اس کے استحکام پر صدقات و زکوٰۃ کی مد سے خرچ کیا جائے جب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور اگر اس کے کسی ایک ہی جزو کی حفاظت و ترقی پر اس کو صرف کیجیے جب بھی وہ فی سبیل اللہ ہے۔

انفاق اور جہاد بالمال کے تعلق کے ساتھ جہاں جہاں فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے ہم اس کی بعض مثالیں یہاں قرآن مجید سے نقل کرتے ہیں تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ اس اصطلاح کے تحت کیا کیا چیزیں آ سکتی ہیں۔

﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ (البقرۃ:۱۹۵)

''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

یہاں فی سبیل اللہ سے مراد جہاد بالسیف ہے جو اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت اور خانہ کعبہ کو کفار کے پنجہ سے چھڑانے کے لیے جاری تھا۔

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ.....﴾ (البقرۃ:۲۶۱)

''ان لوگوں کے خرچ کی مثال جو اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں' ایسی ہے جیسے ایک دانہ اگائے سات بالیاں.....''

یہاں فی سبیل اللہ سے مراد عام مصارفِ خیر ہیں جن میں نیکی اور بھلائی کے سارے کام داخل ہیں۔

﴿اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی .....﴾ (البقرۃ:۲۶۲)

''جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنا مال اللہ کے راستہ میں اور اس خرچ کے پیچھے اظہارِ احسان اور ایذا کی بلا نہیں لگا دیتے.....''

مذکورہ آیت میں بھی فی سبیل اللہ سے فقراء اور مساکین اور اس طرح کے دوسرے مستحقین مراد ہیں۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ﴾ (البقرۃ:۲۷۳)

''ان فقراء کے لیے خرچ کیا جائے جو اللہ کی راہ میں بند ھ گئے ہیں اور زمین میں ہاتھ پاؤں نہیں مار سکتے''۔

اس آیت میں سیاقِ کلام سے واضح ہے کہ فی سبیل اللہ سے مراد دین اور علمِ دین مراد ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ لِیَصُدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ﴾ (الانفال:۳۶)

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا وہ اپنا مال اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکیں''۔

یہاں سبیل اللہ سے مراد اسلام بحیثیت مجموعی ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ.....﴾ (الانفال:۷۲)

''بے شک جو لوگ ایمان لائے' جنہوں نے ہجرت کی اور جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا.....''

یہاں فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے مراد اقامتِ دین کی جدوجہد بحیثیتِ مجموعی ہے۔

اسی طرح ابوداؤد کی ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج بھی فی سبیل اللہ میں شامل ہے۔ فان الحج من سبیل اللہ۔

مذکورہ بالا استعمالات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کے اندر نیکی اور خیر کے سارے ہی کام داخل ہیں۔ اگر یہ لفظ تنہا بولا جائے تو اس سے خیر کا کوئی خاص کام بھی مراد ہوسکتا ہے اگر موقع کلام کسی خاص چیز کو متعین کردے اور پورا دین بھی اس سے مراد ہوسکتا ہے اگر موقع عمومیت کا ہو۔ اور اگر نیکی اور بھلائی کے چند متعین کاموں کے ساتھ اس کا ذکر آئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان خاص خاص کاموں کے بعد اس جامع اصطلاح نے بقیہ دوسرے دین کے سارے کاموں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ یہ میں نے جو کچھ عرض کیا ہے بعینہٖ یہی بات دوسرے محقق علماء نے بھی لکھی ہے۔

علامہ آلوسی حنفی اپنی تفسیر روح المعانی میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کے تحت حنفیہ کا مسلک نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قیل المراد طلبة العلم واقتصر علیه فی الفتاوی الظهیریة وفسره فی البدائع بجمیع القرب فیدخل فیه کل من سعی فی طاعة الله تعالیٰ وسبل الخیرات (تفسیر روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۱۰)

''کہا گیا ہے کہ اس سے مراد طالب علم ہیں اور فتاوی ظہیریہ میں اس مد کو طلبہ ہی تک محدود کردیا گیا ہے۔ لیکن ''بدائع الصنائع'' میں اس کی تفسیر یوں کی گئی ہے کہ اس میں نیکی اور قرب الٰہی کے سارے ہی کام داخل ہیں' تو جو شخص بھی اللہ کی اطاعت اور بھلائی کے کاموں میں جدوجہد کرے گا وہ اس میں شامل ہوگا۔''

ابن عربی احکام القرآن میں امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال مالك سبل الله كثيرة ۔ احمد واسحاق قالا انه الحج والذی یصح عندی من قولهما ان الحج من جملة السبل مع الغزو

''فی سبیل اللہ کے متعلق امام مالکؒ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ کے راستے بہت سے ہیں۔ امام احمد اور اسحٰق کا قول یہ ہے کہ اس سے مراد حج ہے' لیکن میرے نزدیک ان کے قول کا صحیح منشا یہ ہے کہ حج بھی جہاد کی طرح اللہ کے راستوں میں سے ایک راستہ ہے''۔

تفسیر کبیر اور تفسیر خازن میں فی سبیل اللہ کے تحت یہ قول ملاحظہ فرمائیے:

واعلم ان ظاهر اللفظ فی قوله وفی سبیل الله لا یوجب القصر علی

الغزاة فلهذا المعنى نقل القفال فى تفسيره عن بعض الفقهاء انهم اجازوا صرف الصدقات الى جميع وجوه الخير من تكفين الموتى او بناء الحصون وعمارة المساجد لان قوله وفى سبيل الله عام فى الكل (تفسیر کبیر' ج ٤' ص ٤٦٤ و خازن' ج ٢' ص ٣٠٧)

''فی سبیل اللہ کے ظاہر الفاظ اس بات کو لازم نہیں کرتے کہ اس مد کو تمام تر مجاہدین کے لیے خاص کر دیا جائے۔ اسی وجہ سے قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ وہ صدقات کو تمام مصارفِ خیر' مثلاً مُردوں کی تجہیز و تکفین' قلعوں کی تعمیر' مساجد کی تعمیر پر خرچ کرنا جائز قرار دیتے ہیں' کیونکہ فی سبیل اللہ کے الفاظ ان تمام چیزوں پر حاوی ہیں۔''

علامہ ابن حزم محلّٰی میں فی سبیل اللہ کے تحت یہ فرماتے ہیں:

قلنا نعم وكل فعل خير فهو من سبيل الله تعالى (المحلى' ج ٦' ص ١٥١)

''ہم کہتے ہیں ہاں' نیکی اور بھلائی کا ہر کام فی سبیل اللہ کے تحت داخل ہے۔''

اس دورِ آخر کے مشہور سلفی عالم علامہ رشید رضا مرحوم اپنی تفسیر المنار میں فی سبیل اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وفى سبيل الله وهو يشتمل سائر المصالح الشرعية العامة هى ملاك امر الدين والدولة واولها واولاها بالتقديم الاستعداد للحرب بشرأ السلاح واغذية الجند ولدوات النقل وتجهيز الغزاة وتقدم مثله عن محمد بن الحكم (تفسیر المنار' ج ١٠' ص ٥٠٥)

''فی سبیل اللہ کے الفاظ ان تمام شرعی مصالح پر مشتمل ہیں جن پر مذہب اور حکومت کا انحصار ہے۔ ان میں سب سے اوّل اور سب پر مقدم یہ ہے کہ جنگ کی تیاری کے لیے اسلحے خریدے جائیں' فوج کے لیے غذائی سامان فراہم کیا جائے' ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے' مجاہدین کو سامانِ حرب سے لیس کیا جائے۔ اسی طرح کا قول محمد بن حکم سے مروی ہے۔''

ہمارے ملک کے بلند پایہ عالم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' میں فی سبیل اللہ کے متعلق اپنی رائے لکھتے ہیں:

''فی سبیل اللہ کا وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے''۔

(سیرت' ج ٥' ص ١٧٦)

مذکورۂ بالا اقوال سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ فی سبیل اللہ کی مد ایک وسیع مد ہے۔ اس میں نیکی اور بھلائی کے سارے ہی کام داخل ہیں۔ اسلام کی دینی و دنیاوی مصلحت کی کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جو اس کے اندر سمٹ نہ آئی ہو۔ اس میں کسی پہلو سے تملیک کا بھی کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ اوّل تو یہاں کوئی چیز ایسی ہے نہیں جس سے تملیک کا مفہوم اخذ کیا جا سکے' لے دے کر ایک ''لام'' تھا' لیکن اس کی جگہ پر بھی جیسا کہ عرض کیا گیا' یہاں ''فِیْ'' ہے جس کے اندر تملیک کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ ثانیاً اگر اس کے تحت تمام مصارفِ خیر آتے ہیں' جیسا کہ ہر مسلک کے علماء اور ائمہ نے تصریح کی ہے' تو تملیکِ شخصی کا تو ان ساری صورتوں میں پایا جانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر ممکن ہے تو تملیکِ اجتماعی کا پایا جانا ممکن ہے اور اس سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ پس اگر بالفرض کسی چیز کے جواز میں اس پہلو سے کسی کو تردّد ہے کہ ''لِلْفُقَرَاءِ'' کی ''لام'' کے یہ منافی ہے تو اس کو چھوڑیئے' یہ دیکھئے کہ وہ فی سبیل اللہ کی مد کے تحت آتی ہے یا نہیں؟ اگر آتی ہے تو اس کے جواز کی یہ دلیل کافی ہے۔

ابن السبیل

ابن السبیل سے مراد مسافر ہے۔ مسافرت بجائے خود ایک ایسی حالت ہے جو بجا طور پر آدمی کو مدد کی محتاج اور مستحق بنا دیتی ہے۔ ایک اوسط درجہ کا آدمی بھی جو اپنے شہر میں ایک کھاتا پیتا آدمی شمار ہوتا ہے' اگر کسی سفر پر مجبور ہو جائے تو اس کے لیے یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ ہر جگہ اپنی ساری ضروریات خود پوری کر سکے۔ یہ تو صرف تھوڑے سے مال داروں ہی کے لیے ممکن ہے کہ وہ جہاں بھی جائیں اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں ٹھہریں' ٹیکسیوں میں گشت کریں اور اگر بیمار پڑ جائیں تو اپنے مستقر ہی پر ڈاکٹر بلا کر علاج کرائیں۔ ایک عام آدمی' اگرچہ وہ محتاج اور فقیر کی تعریف میں نہ آتا ہو' سفر میں اپنی ساری ضروریات اگر خود اپنی جیب کے بل پر پوری کرنی چاہے تو یہ اس کے لیے ناممکن ہوگا۔ وہ تو بہرحال مجبور ہوگا کہ اگر رات گزارنی ہو تو کسی مسافر خانہ یا سرائے کا پتا معلوم کرے' اگر بیمار ہو جائے تو کسی خیراتی شفاخانہ میں داخل ہونے کی کوشش کرے اور اگر ٹرانسپورٹ کا کوئی رعایتی یا مفت ذریعہ ہاتھ آ جائے تو اس سے فائدہ اٹھائے۔ اگر وہ یہ کچھ نہ کرے گا تو اس کے لیے کسی لمبے سفر کے مصارف کا بار اٹھانا ناممکن ہو جائے گا۔ اس وجہ سے شریعت نے اس کو عام معنوں میں محتاج نہ ہونے کے باوجود صدقات و زکوٰۃ سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا ہے۔ ابن کثیر نے ابوداؤد کے حوالہ سے یہ

روایت نقل کی ہے:

قال رسول اللّٰہ ﷺ :((لا تحل الصدقة لغنی الا فی سبیل اللہ وابن السبیل او جار فقیر فیهدی لك او یدعوك)) (ابن کثیر' ج ۲' ص ۳۶۶)

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی غنی کے لیے صدقہ جائز نہیں ہے مگر تین صورتوں میں: وہ اللہ کی راہ میں ہو' یا مسافر ہو' یا کوئی غریب پڑوسی ہو جو صدقہ کے مال میں سے تمہارے لیے ہدیہ بھیجے یا کھانے پر بلائے''۔

اس وجہ سے یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کہ صرف انہی مسافروں کو صدقات سے استفادہ کا مستحق سمجھا جائے جن کا کرایہ ٹھہر گیا ہو یا جن کا اونٹ مر گیا ہو' بلکہ عام مسافروں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ بلکہ تملیک شخصی کی پابندی نہ باقی رہنے کی صورت میں تو بہتر شکل مسافروں کو فائدہ پہنچانے کی یہ ہے کہ تمام ایسی مرکزی جگہوں پر جہاں ہر طبقہ کے مسلمان جمع ہونے پر مجبور ہوتے ہوں اور تمام ایسے شہروں میں جن میں عموماً باہر کے مسلمان آمد و رفت رکھتے ہوں' مسافروں کی سہولت اور آسائش کے لیے مسافر خانے اور رباطیں بنائی جائیں' جہاں اس امر کا بھی اہتمام ہو کہ ان کے پیش نظر مقصد کے لحاظ سے ضروری معلومات فراہم کی جا سکیں' ان کی ڈاک اور تار کا اہتمام ہو' اور ضرورت کے مطابق ان کے لیے طبی امداد بھی بہم پہنچ سکے۔ مکہ' مدینہ' منیٰ اور جدہ میں جتنی اس کی ضرورت ہے اس سے قطع نظر کیا کراچی' لاہور' پشاور اور اس طرح کے دوسرے شہروں میں مسافروں کے لیے اس طرح کی سہولتیں فراہم کرنے کی شدید ضرورت نہیں ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسافر بسا اوقات اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں؟ لیکن ہمارے کسی شہر میں بھی ایسے ادارے موجود نہیں ہیں جو مسافروں کو ان کی مطلوبہ سہولتیں بہم پہنچانے کے ذمہ دار ہوں۔

ابوعبید نے کتاب الاموال میں انسؓ بن مالک اور حسن بصری کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ:

قالا ما اعطیتَ فی الجسور والطرق فهی صدقة ماضیة

(کتاب الاموال' ص ۵۷۴)

''ان دونوں کا یہ قول ہے کہ پلوں اور راستوں کی تعمیر میں جو کچھ تم نے دیا وہ بھی صدقہ ادا شدہ ہے''۔

ممکن ہے کہ ان بزرگوں نے اس کو فی سبیل اللہ کے تحت داخل کیا ہو' لیکن بالکل مساوی ہی

درجہ کا ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ اس کو ابن السبیل کے تحت لائے ہوں۔

قربانی کی کھالوں کا شرعی حکم

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ صدقات و زکوٰۃ کی معروف اقسام کو پیش نظر رکھ کر عرض کیا گیا ہے' لیکن خاص قربانی کی کھالوں سے متعلق ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے' وہ یہ کہ کیا ان کی نوعیت بعینہٖ وہی ہے جو عام صدقات و زکوٰۃ کی ہے یا ان سے کچھ مختلف ہے؟ بعض واضح دلائل کی بنا پر اس عاجز کا رجحان یہ ہے کہ ان کی نوعیت صدقات و زکوٰۃ کی معروف اقسام سے بالکل مختلف ہے۔

اس اختلاف کی ایک واضح دلیل تو یہ ہے کہ زکوٰۃ کی عام طور پر جو تعریف کی جاتی ہے اس کا کوئی جزو بھی اس کے اوپر صادق نہیں آتا۔

زکوٰۃ کی تعریف عام طور پر یہ کی جاتی ہے:

''نصاب مقررہ کا کوئی حصہ کسی فقیر یا اس طرح کے کسی ایسے آدمی کو دینا جس کو دیے جانے میں کوئی شرعی مانع موجود نہ ہو اور یہ دینا اس طرح ہو کہ عطا کردہ مال سے دینے والے کا کوئی مفاد وابستہ نہ رہے۔''

اب آیئے دیکھئے کہ اس کا کوئی جزو بھی قربانی کی کھالوں پر صادق آتا ہے؟

قربانی کی کھالیں نصاب کا کوئی جزو نہیں ہیں۔ ان کو لازماً کسی فقیر ہی کو دینا ضروری نہیں ہے۔ آپ خود بھی اپنی قربانی کی کھال اپنے کسی ذاتی مصرف میں لا سکتے ہیں' اپنے کسی دوست کو دے سکتے ہیں' کسی غریب اور محتاج کو دے سکتے ہیں' بیچ کر اس کی قیمت صدقہ کر سکتے ہیں' بس اگر ممانعت ہے تو اس بات کی ہے کہ بیچ کر اس کے دام کھرے کرنے کی فکر نہ کیجیے۔

اس کے دینے میں کسی ہاشمی یا غیر ہاشمی کے امتیاز کی کوئی وجہ بھی بظاہر نظر نہیں آتی' کیونکہ اس کے اوپر ''لوگوں کے مال کا میل'' ہونے کی تعبیر کسی طرح بھی صادق نہیں آتی۔ دینے والے کا اپنا مفاد بھی اس سے منقطع ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی قربانی کی کھال کی جانماز بنا کر محلہ کی مسجد پر وقف کر دے تو اس پر وہ خود بھی نماز پڑھ سکتا ہے اور دوسرے مسلمان بھی اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اب میں مختصراً قرآن و حدیث اور فقہ کی کتابوں سے مذکورہ باتوں کی دلیلیں نقل کرتا ہوں۔

جہاں تک قربانی کے گوشت کا تعلق ہے' اس کا ذکر تو خود قرآن ہی میں موجود ہے کہ اس

کو کھاؤ' کھلاؤ اور غریبوں کو دو۔

﴿فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ﴾ (الحج)

''پھر اس میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ فقیر کو بھی کھلاؤ۔''

اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ یہ نکتہ ملحوظ رکھنے کا ہے کہ اس میں فقیر کو دینے کا ذکر ''اٰتُوْا'' یا ''تَصَدَّقُوْا'' کے الفاظ کے ساتھ نہیں آیا ہے' بلکہ ''اَطْعِمُوْا'' کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض کر لیا جائے کہ اِیتاء اور تَصَدّق کے الفاظ تملیک شخصی کے مفہوم کے لیے آتے ہیں' جیسا کہ دعویٰ کیا جاتا ہے' تو کیا ''اطعام'' کا لفظ بھی تملیکِ شخصی کے مفہوم کا حامل ہے؟ اگر ایک شخص اپنا قربانی کا گوشت پکا کر بہت سے غریبوں کو بلا کر ایک دعوتِ عام کی صورت میں کھلا دے تو کیا یہ اطعام نہ ہوگا؟ حالانکہ ''فتح القدیر'' کی تصریح کے مطابق اس صورت میں تملیک نہیں پائی گئی جس کو صدقات و زکوٰۃ کی شرط لازم قرار دیا گیا ہے۔

جو حکم قربانی کے گوشت کا ہے' احادیث اور فقہاء کی تصریحات سے ثابت ہے کہ بعینہٖ وہی حکم قربانی کی کھالوں کا بھی ہے۔ یعنی ایک شخص اپنی قربانی کی کھال خود اپنے کسی ذاتی مصرف میں بھی لا سکتا ہے' کسی کو ہبہ بھی کر سکتا ہے اور کسی محتاج اور غریب کو صدقہ بھی کر سکتا ہے۔ بس یہ بات ناجائز ہے کہ خصیوں اور لیکموں کی طرح اس کو بیچ کر سرمایہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ قتادہ بن نعمان سے روایت ہے کہ:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قام فقال: ((انی کنت امرتکم ان لا تاکلوا لحوم الاضاحی فوق ثلاثۃ ایام لیسعکم' وانی احلہ لکم فکلوا ما شئتم ولا تبیعوا لحوم الھدی والاضاحی وکلوا وتصدقوا واستمتعوا بجلودھا ولا تبیعوھا)) (نیل الاوطار' ج ۵' ص ۱۳۷)

نبی ﷺ کھڑے ہوئے اور آپؐ نے خطبہ دیا کہ ''میں نے تم کو یہ حکم دیا تھا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھ چھوڑا کرو' یہ حکم اس لیے دیا تھا کہ وہ تم سب کے لیے کافی ہو سکے۔ اب میں اس کو تمہارے لیے جائز کرتا ہوں۔ پس تم اس کو جس طرح چاہو برتو' البتہ ہدی یا قربانی کا گوشت بیچو نہیں۔ کھاؤ' خیرات کرو اور ان کی کھالوں سے فائدہ اٹھاؤ' البتہ ان کو بیچو نہیں۔''

اس حدیث سے واضح ہے کہ قربانی کے گوشت اور اس کی کھال کے مصرف میں کوئی

خاص فرق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص چاہتا ہے تو اس کو اپنے کسی ذاتی مصرف میں بھی لا سکتا ہے' لیکن اس کو سرمایہ بنانے کا ذریعہ نہ بنائے' بلکہ اس کو صدقہ کر دے۔ فقہاء کی تصریحات بھی اس کے متعلق یہی ہیں۔

امام شوکانیؒ مذکورہ حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

وفيه ايضاً الاذن بالانتفاع بها بغير البيع وقد روى عن محمد بن الحسن ان له ان يشترى بمسكها غربالا او غيرها من آلة البيت لا شيئا من المأكول ۔ وقال الثورى لا يبيعه ولكن يجعله سقاً وشناً فى البيت (نیل الاوطار' ج ۵' ص ۱۳۸)

"اور اس حدیث سے بیچے بغیر ان کھالوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نکلتی ہے۔ محمد ابن حسن سے مروی ہے کہ اس کھال کے بدلہ میں آدمی گھر کے لیے چھلنی یا اس طرح کی گھریلو چیزوں میں سے کوئی چیز حاصل کر سکتا ہے' البتہ کھانے پینے کی کوئی چیز اس کے بدلہ میں نہ حاصل کرے۔ امام ثوری کہتے ہیں کہ اس کو بیچے نہیں' گھر کے لیے ڈول یا مشکیزہ بنالے"۔

حنفی فقہاء کی تصریحات اس بارہ میں یہ ہیں:

ولما جاز الاكل منها دل على جواز الانتفاع بجلودها من غير جهة البيع ولذالك قال اصحابنا يجوز الانتفاع بجلد الاضحية وروى ذالك عن عمر وابن عباس وعائشة وقال الشعبى كان مسروق يتخذ مسك اضحيته مصلى ويصلى عليه

(احکام القرآن' ابوبکر جصاص' ج ۳' ص ۲۹۳)

"جب قربانی کا گوشت کھانا جائز ہوا تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی کھالوں سے آدمی فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے بشرطیکہ اس کو بیچ کر اس سے سرمایہ بنانے کی کوشش نہ کرے۔ اسی وجہ سے ہمارے علماء کا مذہب یہ ہے کہ قربانی کی کھال سے فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ یہی بات حضرات عمرؓ ابن عباسؓ اور حضرت عائشہ ؓ سے بھی مروی ہے۔ شعبی کہتے ہیں کہ مسروق اپنی قربانی کی کھال کی جانماز بنالیا کرتے اور اس پر نماز پڑھا کرتے"۔

غور فرمایئے کہ زکوٰۃ و صدقات کی تمام معروف اقسام میں سے ہے کوئی قسم ایسی جس میں آدمی کے لیے یہ سارے تصرفات جائز ہوں کہ وہ اس سے خود بھی فائدہ اٹھا سکے اور

بلا امتیاز امیر و غریب' سید و غیر سید' کسی دوسرے کو بھی دے سکے اور اس کو صدقہ بھی کر سکے؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے تو آخر یہ بات کس طرح صحیح ہو سکتی ہے کہ وہ ساری شرطیں جو صدقاتِ واجبہ کے لیے مقرر ہیں وہ اس پر بھی لاکر چسپاں کر دی جائیں؟ ہم نے تھوڑی دیر کے لیے فرض کیا کہ تملیک ادائیگیٔ زکوٰۃ کے لیے رکن کی حیثیت رکھتی ہے' لیکن کیا قربانی کی کھال زکوٰۃ اور صدقہ ہے کہ اس پر سارے احکام صدقہ اور زکوٰۃ کے عائد کیے جائیں؟

میں نے تو مذکورۂ بالا احادیث و اقوال کی روشنی میں جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ قربانی کے گوشت اور اس کی کھالوں کا معاملہ صدقات و زکوٰۃ کے سلسلہ سے تعلق رکھنے کے بجائے مکارمِ اخلاق' فیاضی اور احسان و تبرع سے تعلق رکھتا ہے۔ آدمی ان کو کھائے' کھلائے' خود برتے اور دوسروں کو ہدیے' تحفے اور صدقے کے طور پر دے۔ بس ان کو سینت کر رکھنے یا بیچ کر سرمایہ بنانے کی فکر نہ کرے۔ غرباء اور محتاجوں کو اس میں سے پوری فیاضی کے ساتھ دے' بلکہ فضیلت یہی ہے کہ اگر خود ضرورت محسوس نہیں کرتا تو سب کچھ صدقہ کر دے' جیسا کہ نبی ﷺ کے اس ارشاد سے واضح ہوتا ہے:

عن علی بن ابی طالب قال امرنی رسول اللہ ﷺ ان اقوم علی بدنہ وان اتصدق بلحومھا وجلودھا واجلتھا (نیل الاوطار' ج ۵' ص ۱۳۷)

''حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ آپ کے قربانی کے اونٹوں کی قربانی کراؤں اور ان کے گوشت' ان کی کھالیں یہاں تک کہ ان کے جھول سب صدقہ کر دوں۔''

اس کی نوعیت عام صدقات و زکوٰۃ کی نہیں ہے کہ آدمی خود کسی نوعیت سے بھی ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا یا ان کے اندر اس کا تصرف مخصوص قواعد و ضوابط کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ بلاشبہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اگر کسی انجمن یا ادارہ کی خدمات کو غرباء کے لیے مفید پا رہا ہے تو اس کو بے تکلف دے سکتا ہے۔ اس میں کسی تملیک کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

آخر میں یہ گزارش ہے کہ یہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اپنے علم کی حد تک میں نے صحیح دلائل سے صحیح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے' لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ سب کچھ حرف حرف ٹھیک ہی ہے۔ اس وجہ سے میں یہ ذمہ داری کے خلاف سمجھتا ہوں کہ اس کو ایک

(باقی صفحہ 33 پر)